Regd. L. No. 7243

Phone, 80

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1975

اس پرچہ میں

جنسی بے راہ روی کے نتائج

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

شاہکار رسالت

عمر فاروقؓ

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات ابھرتے ہیں کہ :-

- اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے ؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا ؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب ؟ ـــــ اور اس کا انداز کیا تھا ؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ :-

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا ؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا ؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے ؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکر قرآن جناب **پرویز** کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

- نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختم نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ مضبوط جلد۔ جاذب نگاہ گرد پوش۔

قیمت :- ۔/45 روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان (سالانہ) ۱۵ روپے غیر ممالک (سالانہ) ۲/۱ پونڈ	۸۰۰۸۰ خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ - لاہور	(۲/۱ ۱) ڈیڑھ روپیہ
جلد (۲۸)	جنوری ۱۹۷۵ء	نمبر (۱)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲

(۲) جنسی بدنہادی کا اثر قوموں کی موت و حیات پر ——— محترم پرویز صاحب ——— ۹

(۳) باب المراسلات ——— ۳۷

(۴) مسجدِ اقصیٰ ——— محترم پرویز صاحب ——— ۴۱

(۵) حقائق و عبر ——— ۴۴

(۶) پاکستان میں قرآن حکیم کی تدریس ——— ۵۳

(۷) احکام القرآن میں نیا اضافہ ——— شاہد عادل میانوالی ——— ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر محمد محسن - لاہور آرٹ پریس انارکلی - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وزیراعظم بھٹو کے حالیہ دورۂ بہاولپور کے دوران ان کے سینۂ فگار سے ایک چیخ ابھری اور فضا کو چیرتی ہوئی حساس دلوں کے اندر اتر گئی۔ انہوں نے پہلے انتہائی دلخراشانہ انداز میں کہا کہ ان کی پارٹی میں رشوت ستانی، بدعنوانی، غنڈہ گردی، رسہ گیری، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اجتماعی مفادات کو پامال کرنے والے گھس آئے ہیں اور جب تک ان کا استیصال نہیں ہوگا، ملک میں انقلاب نہیں آسکتا۔

اس کے بعد انہوں نے بڑے یاس انگیز انداز میں کہا کہ اگر انہیں پانچ سو فدائی مل جائیں تو وہ ملک کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ "فدائی" کی اصطلاح انہوں نے غالباً فلسطین کی تحریک آزادی سے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصد ان کا یہ ہے کہ اگر انہیں پانچ سو ایسے رفقاء مل جائیں جن کی سیرت پاکیزہ اور کیرکٹر پختہ ہو تو وہ اپنے حسب منشا انقلاب لا سکتے ہیں۔

یہاں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیرکٹر بنتے کیسے ہیں اور وہ پیدا کیسے ہوتا ہے۔ کیرکٹر کے متعلق دنیا کے لٹریچر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس سے مطالعہ کے کمرے بھر سکتے ہیں۔ ہم نے خود طلوع اسلام کے صفحات پر بھی اس ضمن میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اسے جس حسین اور سادہ انداز میں ایک مثال کے ذریعے پرویز صاحب نے سمجھایا ہے اس سے بہتر انداز شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان کے مجموعہ مضامین بعنوان "بہارِ نو" میں ایک مقالہ ہے جس کا موضوع ہے "ہم میں کیرکٹر کیوں نہیں؟" اسے انہوں نے نومبر ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا۔ جس مثال سے انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا، اتنے میں ایک آدمی گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ باورچی اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

اس کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا اور اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیان کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن اسے کیرکٹر نہیں کہا جائے گا۔ اسے زیادہ سے زیادہ سمجھ بوجھ کی بات کہا جائے گا۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ اب اس مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو اس سے اہل خانہ نے کہا کہ بھئی، یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن حرام کی کمائی کا ہے۔۔ اب سوچئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس کے پیش نظر وہ اسے مزے لے کر کھا لے گا اور حرام حلال کے سلسلہ میں صد ہا تاویلیں نکال لے گا اور ہزار گنجائشیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے کیریکٹر کہا جاتا۔

بھوک، انسان کا طبعی تقاضا ہے جس میں حیوان اور انسان، دونوں شامل ہیں۔ لیکن حرام و حلال کی کمائی کا امتیاز نہ طبعی زندگی کا تقاضا ہے اور نہ اس میں کوئی حیوان شریک ہوتا ہے۔ اس قسم کی تمیز کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے اور یہی امتیاز حیوانی اور انسانی زندگی کی حد فاصل ہے۔ اسی کو کفر اور اسلام کا امتیازی نشان کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کہا ہے "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) وہ زندگی جس میں مقصدِ حیات صرف حیوانی زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا ہوتا ہے، کفر کی زندگی ہے۔ اسلام کی زندگی یہ ہے کہ جسم کے تقاضوں کو ضرور پورا کیا جائے لیکن جب بھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی تقاضا اور مستقل قدر میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ ان میں (TIE) پڑ جائے تو پھر جسم کے تقاضے پر مستقل قدر کی پابندی کو ترجیح دی جائے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ اسی کو "کیریکٹر" کہتے ہیں۔

جسم کے تقاضے تو ہر انسانی بچہ ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن مستقل اقدار اسے پیدائش کے ساتھ نہیں ملتیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ لیکن وحی کے ذریعے بھی انسان کو ان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ان کی نگہداشت اور پابندی انسان کو خود کرنی ہوتی ہے اور یہ چیز مناسب تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے تعلیم اس امر کی، کہ انسانی زندگی محض جسم کی زندگی نہیں، اس کی سطح اس سے بلند ہے اور تربیت اس امر کی، کہ ان اقدار کی پابندی سے اس کی انسانی زندگی کی حفاظت اور پرورش ہو گی اور ان کی خلاف ورزی سے اس زندگی کی ہلاکت۔ اسے دین کی اصطلاح میں "ایمان" کہا جاتا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کو نہ اس قسم کی تعلیم دی جائے اور نہ ہی ان کی ایسی تربیت کی جائے، تو ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ ان میں سیرت کی پاکیزگی اور کیریکٹر کی پختگی پیدا ہو جائے گی؟

اس مقام پر قرآن نے ایک بڑا دلآویز نکتہ بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نہ خدا پر ایمان رکھتی ہیں اور نہ مستقل اقدار پر یقین۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایسے صاحب کردار ملتے ہیں جو اجتماعی مفاد کی خاطر اپنے انفرادی مفاد اور طبعی تقاضوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی ان کے "ایمان" کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کا یہ ایمان غلط اقدار پر ہوتا ہے جسے وہ باطل کہہ کر پکارتا ہے مثلاً سورۃ النحل میں ہے "اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۱۶/۷۲)

یہ اُسی قسم کا "ایمان" ہوتا ہے جس کی رُو سے (مثلاً) ڈاکوؤں کے گروہ کا ایک فرد سُولی کے تختہ پر لٹک جاتا ہے لیکن اپنے گروہ کے خلاف غداری نہیں کرتا۔ یا اقوامِ مغرب کے افراد اپنے قومی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ اقدار پست سطح کی اور تخریبی ہیں لیکن ان کی پابندی کے لئے بھی "ایمان" ناگزیر ہے۔ قرآن زندگی کی بلند اقدار دیتا ہے اور ان کی پابندی کو کیریکٹر یا حسین کردار کہہ کر پکارتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، ہماری قوم کہ ہم نے جس کی تعلیم میں نہ بلند اقدار کا علم شامل کیا اور نہ ہی ان کی تربیت۔ ان کی پابندی کے خوشگوار نتائج سامنے لائے، اس قوم میں صاحبِ کردار کہاں سے مل سکیں گے۔ یہ تو غنیمت سمجھئے کہ ابھی ان میں "پچھلے وقتوں" کے کچھ لوگ باقی ہیں جن کی تعلیم و تربیت، بلند اقدار کی فضا میں ہوئی تھی۔ یہ رفتہ رفتہ اٹھتے جا رہے ہیں۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے تو اس کے بعد آپ دیکھئے گا یہ ملک درندوں کی بھٹ بن کر رہ جائے گا۔ یہاں کسی انسانی قدر کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اقدار کے حامل جو لوگ ابھی باقی ہیں، قوم ان سے بہرہ یاب کیوں نہیں ہو سکتی، اور مسٹر بھٹو کیوں بصد حسرت و یاس یہ کہتے ہیں کہ انہیں پانچ سو اباب کردار بھی نہیں ملتے۔ [پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر رامے نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انہیں گیارہ رفقاء بھی ایسے نہیں ملتے جن کی دیانت اور امانت پر اعتماد کیا جا سکے] یہ نہیں کہ ملک میں ایسا قحط الرجال ہو گیا ہے کہ کروڑوں کی آبادی میں ہزار پانچ سو یا دس گیارہ افراد بھی صاحبِ کردار نہیں رہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، یہ لوگ موجود ہیں۔ لیکن ان کی پختگیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت سے قوم کی محرومی کی وجہ مغربی انداز جمہوریت ہے۔ جس نے یہاں نہ انسانیت کو ابھرنے دیا ہے، نہ دین کو پنپنے۔ اس نظام کا بنیادی نقص وہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان چند سادہ سے الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بندوں کو تولنے کی ترازو سیرت و کردار ہے، لیکن "گننے" میں اس وزن کی نہ کہیں ضرورت سمجھی جاتی ہے نہ گنجائش اس میں انسان ڈھور ڈنگر کی طرح گنے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (پھر حضرتِ علامہ ہی کے الفاظ میں) "اس طرح گن کر جمع کئے ہوئے دو سو گدھوں کے مغز کا وزن ایک انسان کی کھوپڑی کے برابر نہیں ہوتا"۔ اس میں پیش آمدہ معاملات کے فیصلے بھی کثرتِ آراء سے ہوتے ہیں اور جہاں تک آراء کا تعلق ہے، غنڈوں، بدمعاشوں، مجرموں رسہ گیروں کی آراء کی بھی وہی اہمیت ہوتی ہے جو پاکیزہ سیرت اور پختہ کردار انسانوں کی آراء کی ہوتی ہے مسٹر بھٹو نے بڑی دلگدازی سے کہا ہے کہ ان کی پارٹی میں اس قسم کے غنڈے، بدمعاش "گھس آئے ہیں"۔ ہم عرض کریں گے کہ یہ لوگ "گھس نہیں آئے"۔ ان کے لئے جمہوریت کا دروازہ کھولا گیا اور یہ اس میں بصد دبدبہ و طنطنہ بایں نمط داخل ہوئے کہ ان کے استقبال کے لئے شادیانے بجائے گئے، پھول نچھاور کئے گئے اور چراغ روشن کئے گئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک میں (خال خال ہی سہی) جو بلند اقدار کے حامل موجود ہیں وہ آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مسٹر بھٹو کی اس دعوت بلکہ پکار پر بھی ملک کے کسی گوشے سے کسی فرد نے بھی لبیک نہیں کہا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ (بقول مسٹر بھٹو) ہجوم "مجرمین" جو پہلے سے اس جمہوری تماشے کی مسندوں پر براجمان ہو چکا ہے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کرتا کہ ان میں کوئی شریف آدمی آ جائے۔ اوّل تو وہ اسے اندر

ہی آنے نہیں دینا چاہتے اور اگر کوئی آجائے تو پھر یہ اسے ذلیل وخوار کر کے نکالنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کرتے ہیں کہ وہ شریف آدمی ان کا حریف ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے یہ شریف لوگ سمجھتے ہیں کہ جب معاملات کے فیصلے آراء کی گنتی سے ہوتے ہیں تو ہم چند نفوس اندر جا کر کیا لیں گے؟ اس لئے وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گزار کر وہ خاموشی سے دنیا سے چلے جائیں۔ کہا جائے گا کہ یہ تو بڑی دون ہمتی اور فرار کی راہ ہے لیکن جمہوریت میں اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہوتا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ قوم کو عملی طور پر مستقل اقدار سے بہرہ ور کیا جائے اور ان کے خوشگوار نتائج سے آشنا۔ اگر مسٹر بھٹو واقعی چاہتے ہیں کہ انہیں اس قسم کے ارباب سیرت وکردار کا تعاون حاصل ہو تو انہیں چاہیئے کہ ان لوگوں کو اس امر کی ضمانت دیں کہ اس "قوم المجرمین" کی کثرت رائے [جس کا رونا انہوں نے رویا ہے] ان لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ ان کا وہ احترام کیا جائے گا جس کے یہ اپنے کیریکٹر کے لحاظ سے مستحق ہیں اور ان کے مبنی برحق وصداقت مشوروں کو قبول کیا جائے گا۔ خواہ ان کے پیش کرنے والوں کی گنتی کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

اب رہا مغربی طرزِ جمہوریت میں اصلاح کا سوال، تو اس کے لئے بڑی بنیادی انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے لئے ہمارے سامنے اس ذاتِ گرامیؐ کا اسوۂ حسنہ شمع نورانی کی طرح چمکتا ہوا موجود ہے جس کے نقوشِ قدم پر چل کر ہی کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ جب حضورؐ نے اپنی قوم کے سامنے اپنے دعوئ نبوت کو پیش کیا تو مخالفین نے کہا کہ آپ کے اس دعویٰ کی صداقت کا ثبوت کیا ہے آپ نے اس ثبوت کو پوری قوم کے سامنے ان چند الفاظ میں پیش کر دیا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (۱۰/۱۶)

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے اندر گزاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے انسان کی ہوتی ہے۔ یا سچے کی۔

پورے حتم ویقین سے یہ اعلان کیا اور تمام قوم کی نگاہیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ کسی نے اس کے خلاف انگلی تک نہ اٹھائی۔ جمہوری طرز میں اس تبدیلی کی ضرورت ہے کہ انتخاب کے وقت ہر امیدوار اپنی سابقہ زندگی کی کتاب قوم کے سامنے رکھ دے اور قوم کو پوری پوری اجازت ہو کہ وہ جس طریق سے چاہے ان کی جانچ پڑتال کر لے۔ امیدواری صرف اسی کی قابل قبول ہوگی جس کی زندگی بے داغ نکلے۔ اگر ووٹرز اس بنیادی تقاضا کو نظر انداز کر کے کسی ایسے شخص کو کامیاب کر دیں جس کی سابقہ زندگی میں سیاہ دھبے ہوں تو اس امیدوار کے علاوہ ان ووٹرز کو بھی مجرم قرار دیا جائے اور سزا کا مستحق۔ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹/۱۳) تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ مستقل اقدار کا پابند ہے" تو اس نے اسلامی نظام خود اختیت کے لئے اسی کو امیدواری کی بنیادی شرط قرار دیا تھا۔ اگر یہ تبدیلی نہ کی گئی تو پھر آپ قیامت تک چیختے چلاتے رہیئے۔ قابلِ اعتماد سیرت وکردار کے حامل آپ کو کبھی نہیں مل سکیں گے۔

ایک اور یادگار مٹ گئی۔

اگر تحریکِ پاکستان کی صحیح تاریخ مرتب کی جاتی تو اس میں طبقۂ علماء میں سے چند ایک ہستیاں چمکتی دمکتی ہوئی دکھائی دیتیں، جنہوں نے اس زمانے میں اس تحریک کا ساتھ دیا جب جمہور علماء (علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں) نیشنلزم کے بت کے پرستار ہو چکے تھے۔ ان میں سرِ فہرست مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا اسمِ گرامی آتا ہے (جو تشکیلِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصے بعد دفعتاً گمنامی کی حالت میں) وفات پا گئے اور اب ان کے رفیقِ سفر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ بھی (پوری گمنامی کے عالم میں) ان سے جا ملے۔ یہ اسی قسم کی ہستیوں کے جذبۂ جہاد کا صدقہ تھا کہ وطن پرستی کا بت ٹوٹا۔ ہم نے اسے جذبۂ جہاد سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ یہ حضرات دارالعلوم دیوبند سے متعلق تھے اور علمائے دیوبند کی اکثریت، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) جیسے متشدد نیشنلسٹ کی زیرِ سرکردگی تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں مصروف جدوجہد تھی، ان حالات میں علی الاعلان تحریکِ پاکستان کی تائید اور حمایت بڑی ہمت اور جرأت کا کام تھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان بالخصوص ان کے صاحبزادگان مولوی عمر احمد عثمانی اور قمر احمد عثمانی کو توفیقِ صبر۔

ایک اور خلا پیدا ہو گیا۔

اسی ماہ قرآنی فکر کے رفقاء کی صف میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ یہ خلا پیدا ہوا ہے رفیقِ محترم ظہور الدین بھٹی کی ناگہانی وفات سے، جو اچھے بھلے رات کو سوئے لیکن پھر جاگے نہیں۔ دنیا یہی جانتی تھی کہ مرحوم ادارۂ طلوعِ اسلام کے مرکزی ستون شیخ عبدالحمید صاحب کے بھائی ہیں لیکن یہ راز ان کی وفات کے بعد کھلا کہ وہ ان کے بھائی نہیں، دوست تھے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ مرحوم کتنی خوبیوں کے مالک تھے۔ جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے اس میں بھی انہوں نے کبھی نام اور نمود سے کام نہ لیا۔ گمنام رفیق وہ رہے اور یہی ان کے خلوص کی زندہ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو اپنے سحابِ کرم سے نوازے اور شیخ عبدالحمید صاحب اور مرحوم کے فرزندِ اکبر تنویر ظہور اور دیگر پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

کراچی میں

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں

پتہ:- دارالقائد ۲۰-۱/۲ بی - ناظم آباد (بس اسٹاپ نمبر ۷) کراچی ۱۸ فون ۶۱۰۴۷۸

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ: ان قیمتوں میں پیکنگ اور ڈاک کا خرچ شامل نہیں

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (پارہ اوّل)	۴/۰۰ روپے
" " (پارہ ۲ تا پارہ ۳۰)	۲/۵۰ " فی پارہ
" " (پارہ ۲۸ و ۲۹ یکجا)	۷/۰۰ " "
" " (پارہ ۳۰)	۵/۰۰ " "
مفہوم القرآن (جلد اول)	۳۵/۰۰ روپے
" " (جلد دوم)	۳۵/۰۰ "
" " (جلد سوم)	۴۰/۰۰ "
" " (مکمل سیٹ)	۱۱۰/۰۰ "
لغات القرآن (جلد اول)	۲۰/۰۰ روپے
" " (" دوم)	۲۰/۰۰ "
" " (" سوم)	۲۰/۰۰ "
" " (" چہارم)	۲۰/۰۰ "
" " (مکمل سیٹ)	۸۰/۰۰ "
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۱۵/۰۰ "
" " (سستا ایڈیشن)	۸/- "
انسان نے کیا سوچا؟	۲۰/۰۰ "
من و یزداں	۲۵/۰۰ "
جوئے نور	۲۰/۰۰ "
ابلیس و آدم	۲۰/۰۰ "
برق طور	۲۰/۰۰ "
کتاب التقدیر	۲۰/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
شاہکار رسالتؐ	۴۵/۰۰ روپے
قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان	۱۵/۰۰ "
معراجِ انسانیت	۳۰/۰۰ "
سلسبیل	۱۰/۰۰ "
فردوسِ گم گشتہ	۱۰/۰۰ "
اسلامی معاشرت	۴/۰۰ "
اسباب زوال امت	۲/۰۰ "
جہاد	۲/۵۰ "
قرآنی قوانین و اقدار	۴/۰۰ "
قرآنی فیصلے جلد اول	۵/۰۰ "
قرآنی فیصلے جلد دوم	۵/۰۰ "
قرآنی فیصلے جلد سوم	۵/۰۰ "
قرآنی فیصلے مکمل سیٹ	۱۵/۰۰ "
طاہرہ کے نام	۶/۰۰ "
مسلیم کے نام جلد اول	۱۰/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
سلیم کے نام (جلد دوم)	۱۰/۰۰ روپے
(جلد سوم)	۱۰/۰۰ "
(مکمل سیٹ)	۳۰/۰۰ "
عربی خود سیکھئے (چوتھا ایڈیشن)	۷/۰۰ "
پاکستان کا معمار اول	۳/۵۰ "
الفتنۃ الکبریٰ (طٰہٰ حسین)	۸/۰۰ "
فجر الاسلام (جلد اول)	۵/۰۰ "
" (جلد دوم)	۵/۰۰ "
اسلام پر کیا گزری؟ (از علامہ احمد امین مصری)	۸/۰۰ "
منزل بہ منزل	۸/۰۰ "
ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION (مجلد)	۳۵/۰۰ "
(پیپر بیک)	۲۰/۰۰ "
قتل مرتد	۲/۰۰ "
عالمگیر افسانے	۱/۰۰ روپیہ

نام کتاب	قیمت
ختم نبوت اور تحریک احمدیت	۱۲/۰۰ روپے
پرنسپلز آف لاء میکنگ ان اسلام (انگریزی)	۳/۰۰ "
جمع القرآن (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	۳/۰۰ "
تاریخ الامت (جلد اول)	۳/۰۰ "
" " (جلد دوم)	۳/۰۰ "
" " (جلد سوم)	۳/۰۰ "
" " (جلد چہارم)	۳/۰۰ "
" " (جلد پنجم)	۴/۰۰ "
" " (جلد ششم)	۴/۰۰ "
" " (جلد ہفتم)	۳/۰۰ "
" " (جلد ہشتم)	۳/۰۰ "
(از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم) (مکمل سیٹ)	۲۵/۰۰ "
QURAN AND PHENOMENA OF NATURE از ڈاکٹر سید عبدالودود	۳۰/۰۰ روپے

ملنے کے پتے

(۱) —— **ادارۂ طلوع اسلام** —— ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲، لاہور

(۲) —— **مکتبہ دین و دانش** —— چوک اردو بازار، لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

رُسوا کیا اِس دَور کو جلوت کی ہوس نے

جِنسی بدنہادی

کا اثر

قوموں کی موت و حیات پر

SEX – PERVERSION

طلوعِ اِسلام کنونیشن مُنعقدہ اکتوبر ۱۹۷۲ء

سے

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنسی بدنہادی

کا اثر

قوموں کی موت و حیات پر

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

قریب بیس سال ادھر کی بات ہے' میں نے سلیم کے نام ایک خط لکھا تھا (جو "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ میں شامل ہے)۔ سلیم' ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا نمائندہ ہے جو اپنے ماحول اور فضا سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں' مذہب اور اخلاق وغیرہ کے متعلق طرح طرح کے شکوک ابھرتے ہیں لیکن چونکہ اس کا قلب سلیم ہے اس لئے وہ ان شکوک کے ازالہ کے لئے قرآنی رہنمائی کی طرف رجوع کرتا ہے' اور جب اس کا اطمینان ہو جاتا ہے تو نہایت کشادہ ظرفی اور طیبِ خاطر سے اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اُس زمانے میں' میں نے محسوس کیا کہ ہماری فضا فحاشی کے جراثیم سے متاثر ہو رہی ہے تو ضروری سمجھا کہ اپنی قوم کے نوجوان طبقہ کو اس خطرہ سے آگاہ کر دوں اور انہیں بتاؤں کہ جنسیات کا مسئلہ محض ایک فرد کا پرائیویٹ مسئلہ نہیں کہ وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کس طرح کرتا ہے۔ اس کا بڑا گہرا اور دور رس تعلق اس قوم کے تمدن اور اس کے مستقبل سے بھی ہے جس کا وہ فرد ہے۔ یہ تھا وہ خط جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اب بیس سال کے عرصہ میں ان جراثیم نے ایسے سیلاب کی شکل اختیار کر لی ہے جس سے پناہ اور حفاظت بڑی مشکل نظر آتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر اُس وقت اس کے اثرات دریا کے ساحلوں تک محدود تھے اور وہ انہی کو متاثر کر سکتے تھے جو اس میں غوطہ زن ہوں' تو آج وہ سیلاب بن کر قریہ قریہ' بستی بستی' گلی گلی' کوچے کوچے میں پھیل چکا' بلکہ گھروں کے اندر تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ باہر سے یہ لہریں اگر مون سون کی گھٹاؤں کی طرح امنڈتے چلا آرہا ہے' تو ملک کی اپنی زمین سے اس کے چشمے' ادب' شاعری' موسیقی' رقص' سینما' فلم' ریڈیو' ٹیلی ویژن بلکہ تراش خراش وضع قطع' زیبائش و آرائش' نمائش' آوارگی' عریانی کی شکل میں قدم قدم پر پھوٹ رہے ہیں' اور اس بدنصیب خطۂ زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ایسا نہیں رہا جو کثافت آلودہ نہ ہو چکا ہو۔

رانیں نہ رند' یہ تو زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے' دو چار دس کی بات نہیں

ان حالات میں' میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے ملک کے نوجوان طبقہ کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کراؤں

کہ جنسی جذبہ کی تسکین ایسا مسئلہ نہیں جس کا اثر متعلقہ فرد یا جوڑے تک محدود ہو۔ یہ ایک اہم اجتماعی مسئلہ ہے جس کا قوموں کی موت اور حیات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہی میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے۔ خدا کرے کہ میرے یہ عزیز میری گذارشات کو جذبات سے الگ ہٹ کر، ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور پھر عقل و بصیرت کی رو سے اس پر غور و فکر کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو پھر وہی نہیں بلکہ ساری قوم تباہی اور بربادی کے ان تاریک، ہولناک غاروں میں گرنے سے بچ جائے گی جن کی طرف وہ اس تیزی سے بہے چلی جا رہی ہے اور جنہیں یہ نوجوان اسے محض کھیل تماشا سمجھ رہے ہیں۔ یہ کھیل تماشا نہیں، بلکہ ایک بحرِ مرگ آفریں ہے جس میں — غالب کے الفاظ میں — دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — یہ وہ جل پریوں (CIRCE) کا جزیرہ ہے جس کی سحر آگیں، مدہوش صداؤں میں کھو کر کوئی کشتی، نہ آج تک سلامت رہی ہے نہ سلامت رہ سکتی ہے۔

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

———— (۲) ————

زندگی کے حیوانی تقاضے

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، ایک درجہ اوپر ابھرتی ہے تو اس میں اس کی سابقہ سطح کے مقابلہ میں، کچھ لطیف اور بلند جوہروں کی نمود ہوتی ہے۔ لیکن وہ سابقہ سطح کی بہت سی خصوصیات اور لزومات بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ انسانی پیکر میں نمودار ہونے سے پہلے، زندگی عام حیوانی سطح پر کارفرما تھی۔ انسانی سطح پر پہنچ کر وہ حیوانی سطح کی جن خصوصیات کو ساتھ لاتی، انہیں حیوانی جبلت یا (Animal Instinct) کہا جاتا ہے، اور علم الحیات کی رو سے انہیں تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (Self-preservation)۔ جذبۂ تغلبِ خویش (Self-aggression) اور جذبۂ افزائشِ نسل (Self-procreation)۔ ان میں تیسرا جذبہ بڑا اہم اور نہایت شدید ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کا پروگرام یہ نہیں کہ جو شے موجود ہے وہ ایک مدت تک موجود رہنے کے بعد معدوم ہو جائے۔ وہ چاہتی یہ ہے کہ اس کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے، خواہ اس کے لئے فطرت کو کتنا ہی طویل اور محنت طلب طریق کار کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ ایک ننھے سے بیج سے پودے کی نمود ہوتی ہے۔ فطرت کس قدر طول طویل پروگرام کے بعد اس پودے کو ایک تناور درخت کا پیکر عطا کرتی ہے۔ فطرت کے نزدیک اس تناور درخت کا منتہیٰ کیا ہے؟ صرف یہ کہ اس میں ایسے بیج پیدا ہوں جن سے درخت کی اس نوع کا سلسلہ آگے بڑھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ درخت سے انسان بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ اس کی لکڑی بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ اس کی سرسبزی اور شادابی کا موسموں پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ اس کے پھل ہمارے لئے لذتِ کام و دہن کا موجب اور جسمانی نشوونما

کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن یہ سب وہ لالچ ہیں جو فطرت نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے انسان کو دے رکھے ہیں۔ فطرت کا مقصد درخت سے بیج پیدا کرنا ہی ہے تاکہ اُس سے اس کی "افزائشِ نسل" ہو۔ حیوانات میں افزائشِ نسل کا سلسلہ جنسی اختلاط کی رو سے ہوتا ہے۔ فطرت نے اپنے مقصد (تسلسل و بقائے انواعِ حیوانی و انسانی) کے حصول کے لئے اس اختلاط میں خاص حظ و کیف کا سامان مضمر رکھا ہے۔ یہ وہ لالچ یا ترغیب ہے جس سے فطرت اپنا کام نکالنا چاہتی ہے۔ زندگی کی بقا، تسلسل اور ارتقار کے لئے ان جذبات کے تقاضوں کا پورا کرنا ضروری ہے جنہیں ہم نے جبلی تقاضے کہہ کر پکارا ہے — کھانا، پینا، صحت کا برقرار رکھنا اور افزائشِ نسل — لیکن زندگی کے ان تقاضوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان جبلی جذبات کو بے محابا اور بے لگام نہ چھوڑا جائے بلکہ ان پر کچھ پابندیاں عاید کی جائیں۔ حیوانات کی صورت میں یہ پابندیاں فطرت خود عاید کرتی ہے — بکری پر فطرت کی طرف سے عاید کردہ پابندی ہے کہ وہ صرف نباتات کھائے، گوشت نہ کھائے۔ شیر پر یہ پابندی ہے کہ وہ صرف گوشت کھائے۔ چونکہ حیوانات کو صاحبِ اختیار پیدا نہیں کیا گیا اس لئے وہ ان پابندیوں پر عمل پیرا رہنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ انہیں ان کے توڑنے یا ان حدود سے تجاوز کرنے کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔

حیوانات اور جنسی جذبہ

کھانے پینے کے علاوہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے۔ ایک بیل سال بھر گایوں کے گلے میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔ لیکن اسے کبھی جنسی اختلاط کا خیال تک نہیں آتا۔ حالانکہ یہ قوت اس میں اس وقت بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب ان کا (Mating season) آتا ہے تو گائے اور بیل دونوں میں یہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور جب ان کے اختلاط سے استقرارِ حمل ہو جاتا ہے تو پھر انہیں اس کا خیال تک نہیں آتا۔ ہر چند بات حیوانی سطح کی ہو رہی ہے اور وہ بھی جنسی اختلاط کے موضوع پر لیکن اس کا کیا علاج کہ اس سلسلہ میں غالب کا ایک نہایت لطیف و نظیف شعر ابھر ابھر کر جھانکتا اور بے نقاب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل کچھ اُدھر کا بھی تقاضا چاہیئے!

حیوانات اُدھر کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔ اشارہ نہیں ہوتا تو ان کا کوئی جذبہ ابھرتا نہیں۔ اور جب اُدھر کا اشارہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس کی تسکین کے لئے مجبور ہی نہیں، بے قابو ہو جاتے ہیں۔ بارِ دگر، غالب کی معذرت کے ساتھ کہ

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

انسان اور جنسی جذبہ

لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا۔ اس لئے ان جذبات کی تسکین کے لئے اس پر

نظرت کی طرف سے کنٹرول نہیں کیا گیا۔ کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر انسان پر اس کے جذبات کے تقاضوں کے سلسلہ میں کوئی پابندی عاید نہ کی جائے، انہیں بے محابا چھوڑ دیا جائے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے بیان کرنے کے لئے یا سمجھانے کے لئے، اقبال کے ان برجستہ الفاظ سے بہتر اور موزوں تر الفاظ شاید ہی مل سکیں۔ کہ ــــ دیوانہ بکار گہِ شیشہ گراں ــــ جیسے کوئی پاگل چینی یا شیشے کے برتنوں کی دکان میں گھس آئے۔ اس معاشرہ کی ایسی ہی حالت ہو جائے گی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر یہ پابندیاں آپ عائد کرے گا۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین یا آداب و ضوابطِ معاشرہ انہی پابندیوں کا نام ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ انسانی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے کا یہ طریق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے جذبات سے الگ ہو نہیں سکتا اس لئے وہ کسی مصلحت یا مجبوری کے ماتحت جب بھی اپنے جذبات پر آپ پابندیاں عاید کرنے کے لئے بیٹھے گا تو اس کے جذبات اسے ان پابندیوں کو توڑنے یا ان سے نکلنے کی ہزار راہیں سجھا دیں گے۔ چونکہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ موضوع ہے اس لئے میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ میں اس وقت صرف اتنی وضاحت کر دوں گا کہ مغربی معاشرہ نے جنسی جذبات کی تسکین کے لئے جو پابندیاں عاید کیں، ان کا نتیجہ یا حشر کیا ہوا؟ ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ ابھی کل کی بات ہے۔ اُس وقت وہاں کا احساسِ ستر پوشی اس قدر شدید تھا کہ عورتوں کی ٹانگیں تو ایک طرف، جس چیز کے لئے بھی ان کی زبان میں ٹانگ (Leg) کا لفظ بولا جاتا تھا، وہ اسے بھی ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ مثلاً وہ پیانو کی (Legs) پر کپڑا چڑھا دیا کرتے تھے، کہ اس کی ٹانگیں ننگی نہ ہونے پائیں۔ اس کے بعد مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر ان کے ہاں جنسیات سے متعلق تصورات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تو اب وہاں کچھ بھی مستور نہ رہا۔ اب وہاں مکمل برہنگی (Nudism) تہذیب کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے وہاں جنسی اختلاط سے متعلق قانون اور معاشرتی تقاضوں میں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئیں۔ پہلے یہ قدم اٹھا کہ اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے شادی کے بغیر جنسی اختلاط پیدا کر لیں، تو اسے نہ قانونی جرم قرار دیا جائے گا، نہ معاشرہ کی نگاہ میں معیوب۔ البتہ اگر اس اختلاط کے نتیجہ میں کوئی بچہ پیدا ہو جاتا اور وہ لڑکا اس لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرتا، تو اس بچے کو حرامی سمجھا جاتا اور معاشرہ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اب وہاں یہ تمیز بھی اٹھ گئی ہے۔ اب اسے معیوب سمجھا ہی نہیں جاتا۔ کچھ سال ادھر (۱۹۵۶ء میں) ان کے ایک میگزین (Esquire) میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا (A Brief For Bastards)۔ اس میں بڑے فخر سے کہا گیا تھا کہ حرامی بچے بڑے ذہین اور فطین ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں، لکھا گیا تھا کہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے مشاہیر میں سے بیشتر حرامی تھے جہاں تک شادی شدہ مرد یا عورت کا کسی دوسرے سے جنسی روابط قائم کرنے کا تعلق ہے، وہ اسی صورت میں جرم قرار پاتا ہے جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ وہاں کی نئی نسل میں جوں جوں فحاشی کے جراثیم عام ہوتے گئے، جنسی روابط اور اختلاط پر پابندیوں کی رسمیاں ڈھیلی پڑتی گئیں۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انگلستان میں مردوں کے باہمی جنسی اختلاط . . . . . .

Homo-sexuality) کو بھی قانوناً جائز تسلیم کر لیا گیا اور امریکہ میں لڑکوں کی باہمی شادیاں باقاعدہ گرجوں میں جا کر ہونے لگیں۔ کائنات میں یہ امتیاز "صرف حضرتِ انسان نے اپنے لئے حاصل کیا ہے۔ بدسے بدتر حیوان کے تصور تک میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ اُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر تو وہ شاید انہی جیسے "مہذب" انسانوں کے لئے کہا تھا! ان کے ہاں (Love) کا لفظ کبھی بڑے مقدس معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اب یہ پستی کی طرف آتے آتے جنسی بدبنیادی (Sex-perversion) کے لئے بولا جانے لگا ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے، انگلستان سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ایک مشہور شخصیت (سابق شاہِ مصر فاروق) کی حرامکاری کی رنگین داستانیں بڑی تفصیل کے ساتھ مزے لے لے کر بیان ہوئی تھیں۔ اس کتاب کا نام رکھا گیا تھا The Greatest Lover Of The World ۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ اب وہاں (Love) سے کیا مراد ہے اور (Lover) کسے کہتے ہیں۔

نئی نسل کی اثر پذیری

یورپ اور امریکہ سے یہی خیالات اب ہمارے ہاں درآمد ہو رہے ہیں اور ہماری سوختہ بخت قوم کی نئی نسل انہیں بڑے ذوق و شوق سے اپناتی چلی جا رہی ہے۔ ان سے بات کیجئے تو (فکرِ مغرب کے تتبع میں) جواب ملتا ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا سوال اگر ایک فرد تک محدود رہے تو کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کا کیا حق حاصل ہے! البتہ اگر اس سے کوئی اور فرد بھی وابستہ یا متاثر ہوتا ہو تو یہ مسئلہ معاشرتی بن جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشرہ جس انداز کو بھی روا تسلیم کرے وہ جائز اور درست قرار پا جانا چاہیئے۔ یورپ اور امریکہ ہم سے زیادہ مہذب ہیں اس لئے انہوں نے ان پابندیوں کو قریب قریب آخری حد تک اٹھا دیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ ابھی قدامت پرست ہے، اس لئے یہ دیگر امور کی طرح اس باب میں بھی ان سے بہت پیچھے ہے۔ رفتہ رفتہ زمانے کے تقاضے انہیں بھی وہاں تک جانے کے لئے مجبور کر دینگے۔" اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت معاشرتی ضوابط کے تعین یا قوانین سازی کا کام قدامت پرست طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ طبقہ ختم ہو جائے گا اور یہ امور نئی نسل کے ہاتھ میں آجائینگے تو ہمارا ملک بھی یورپ یا امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کے ہمدوش چلنے کے قابل ہو جائے گا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے ان نوجوانوں کے نزدیک جنسی اختلاط کے نتائج و عواقب کا ایک فرد یا ایک جوڑے تک محدود ہوتے ہیں، اس لئے ان کی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اگر چاہتا تو نہیں (اپنے طور پر، یعنی قرآن کریم کی روشنی میں) بتاتا کہ ان کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ جنسی اختلاط افراد کا پرائیویٹ معاملہ ہے اور کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ ان نوجوانوں کے نزدیک "مذہب پرست" قدامت پسندوں کی کوئی رائے یا مشورہ قابلِ اعتنا نہیں ہوتا، قابلِ سند اور اعتماد مغربی محققین کی تحقیقات اور وہاں کے مفکرین کے فکری نتائج ہوتے

ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس سلسلہ میں میں اپنے ان عزیزوں کے سامنے مغرب ہی کے ایک نامور محقق کی تحقیق کے نتائج پیش کروں۔ یہ محقق ہے کیمبرج یونیورسٹی کا ڈاکٹر J. D. Unwin اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے اسی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا کہ انسانی زندگی میں جذبات اور کلچر کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان قبائل میں اگر ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا تھا تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعہ اور تحقیق کے نتائج کو اپنی گرانقدر تصنیف میں پیش کر دیا جس کا نام ہے Sex And Culture (میں نے سلیم کے نام اس خط میں جس کے تذکرہ سے میں نے آغاز کلام کیا ہے، اس کتاب کے ضروری اقتباسات درج کئے تھے۔ اب انہی کو پھر پیش کیا جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ انہیں بالخصوص غور سے سنے گا۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:-

> دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی متمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

متن کتاب سے بھی پہلے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی متمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (XVII)

اسی کلیہ کو اس نے متن کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (ص ۳۲۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک جبلی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دار و مدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے حتیٰ کہ ڈاکٹر اَن وِن یہ بھی لکھتا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی متمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی متمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص [illegible])

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی تقریباً سو سال میں)

نمودار ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۳)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اُسے دنیا میں تمدنی عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرّد

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (Celibacy) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلک خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

جبری تجرّد (Compulsory celibacy) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (صفحہ [illegible])

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقاید یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (Nuns) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلک خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی وجہ شرف انسانیت ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عاید کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صفحہ XI)

(٠)

تین گروہ

اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (Zoistic) رکھتا ہے۔ اس سے اوپر (Manistic) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (Deistic) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ ان قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (Pre-nuptial) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھا۔

(۲) جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عاید تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت دوشیزگی (Chastity) کا شدت سے تقاضا کرتے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (صفحہ ۳۲۵-۳۲۶)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ

شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو، بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (Absolute Monogamy) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (Modified Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعددِ ازواج (Absolute Polygamy) ہے اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعددِ ازواج (Modified Polygamy) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

آج تک کوئی قوم مطلق وحدتِ زوج کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ (ص۳۴۳)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے۔ اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر، کامل آزادی کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (ص۳۴۵)

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے، ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی

بہترین تمدن کی حامل قوم تھی اور شادی کے بعد تک ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی. یعنی جن کا اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے. رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو. بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہو سکتا ہو. یہ وہی شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عاید کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر اَنوِن نے مختلف ماہرین علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (Tension) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (Compression) پیدا ہو جاتا ہے (ص ۳۱۲)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے لئے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں لطافت (Sublimation) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اَنوِن کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے. نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (ص ۳۱۱)

فرائڈ کی تحقیق بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے. کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے. جب ان پر کچھ پابندیاں عاید کر دی جائیں تو یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں. (جسے Sublimation کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فاضل توانائی جنسی کوشش کی طرف سے ہٹ کر ان کوششوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

S. Freud, Introductory Lectures on Psycho-Analysis, Translated by J. Riviere. P. 17

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں۔

۱؎ اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر پر بالعموم جس قدر غلو کر رکھا ہے اور اس کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہو رہے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں. ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے. یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا. ویسے فرائڈ ایک بڑی حد تک بعض غلط فہمیوں کا شکار بھی ہوا ہے. اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب (Islam: A Challenge To Religion) میں تعرض کیا ہے۔

ڈاکٹر اون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس۔

> جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کریں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قید و جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (صفحہ ۳۹۹)

اضمحلال

جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے، اسے تو میں آگے چل کر بیان کروں گا لیکن اس وقت ایک ایسا نکتہ سامنے آگیا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا يَزْنُونَ۔ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اثام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اٰثِمَۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

(o)

اس کے بعد ڈاکٹر اون، دورِ حاضر کی (نام نہاد) مہذب اقوام کی طرف آتا ہے، اور کہتا ہے کہ انہوں نے بھی جنسی پابندیوں کو اس طرح ڈھیل دینی شروع کر دی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سے جس قسم کی سوسائٹی متشکل ہوتی ہے، اس کے متعلق یہ محقق لکھتا ہے کہ

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے، اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی ہوتی ہے نہ لڑکے پر۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش بیدار ہوتی، اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (صفحہ ۳۴۸)

اس کا نتیجہ

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے خود ڈاکٹر اون کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

لوگ چاہتے ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم کی زندگی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت، کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو لیڈر ان میں مفاہمت، (Compromise) کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ہو، اُسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ (صد ۱۳۱ الف)

بنا بریں'

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صد ۳۱۲)

———— (۷) ————

قرآنی تعلیم

ڈاکٹر انون کی تحقیق اور اس کے نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد آپ قرآن کریم کی طرف آئیے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم رہبانیت یا خانقاہیت کی تعلیم نہیں دیتا جس میں جنسی جذبات بلکہ دنیاوی زندگی کی ہر کشش اور جاذبیت کو قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے۔ وہ جبلی تقاضوں کا پورا کرنا اور دنیاوی جاذبیتوں سے متمتع ہونا تقاضائے حیات قرار دیتا ہے۔ ان کے لئے البتہ وہ کچھ حدود اور پابندیاں عاید کرتا ہے اور یہ پابندیاں چونکہ وحی کی رُو سے عاید ہوتی ہیں اس لئے ابدی اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔ یعنی یہ پابندیاں نہ معاشرہ کی وضع کردہ ہوتی ہیں اور نہ ہی معاشرہ یا کوئی نظامِ حکومت ان میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے جب جنسی جذبات کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کیا جائے تو وہ اسے "حفاظتِ فروج" یا (عام الفاظ میں) عصمت کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عصمت کی حفاظت پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جنسی جذبہ کی تسکین کا ایک ہی طریق جائز ہے اور وہ ہے نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط، یا نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی اور عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ ان کی باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے اور زنا سنگین جرم۔ نکاح کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ محض وقتی جنسی اختلاط کے لئے باہمی رضامندی کا نام نہیں۔ یہ عاقل، بالغ، لڑکے اور لڑکی کا باہمی معاہدہ ہے اس امر کا کہ ہم ان تمام حدود و قیود

اور فرائض و حقوق کے مطابق، جنہیں قرآن نے عاید کیا ہے میاں بیوی کی حیثیت سے باہمی رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (۴/۲۱) پختہ عہد کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا کہ جب جی چاہا یہ کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس متحکم گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ اس نے وحدتِ زوج (Monogamy) کو بطورِ اساسی اصول مقرر کیا ہے، اور تعددِ ازدواج کو محض ایک ہنگامی معاشرتی مشکل کے حل کے لئے جائز قرار دیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط") اس معاہدہ کو عندالضرورت فسخ کرنے کے لئے جسے طلاق کہا جاتا ہے، اس نے احکام و ضوابط مقرر کئے ہیں۔ یہ نہیں کہ جب جی چاہا اسے ایک، دو، تین کہہ کر توڑ دیا اور دوسری بیوی گھر لے آئے۔

عصمت کی تاکید

ہمارے ہاں عام طور پر عصمت کا لفظ لڑکیوں یا عورتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ لڑکوں یا مردوں کے لئے نہیں اور با عصمت ہونا لڑکیوں کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہے، لڑکوں کے لئے نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے حفاظتِ عصمت، لڑکوں اور لڑکیوں، مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی دونوں کے لئے ایک جیسا جرم اور اس کی ایک جیسی سزا۔ اس نے جہاں جہاں حفاظتِ عصمت کا حکم دیا ہے وہاں مردوں کو پہلے مخاطب کیا ہے، عورتوں کو بعد میں۔ اس میں بھی ایک نکتہ پنہاں ہے۔ اگر معاشرہ میں مرد باعصمت ہو جائیں تو عورتیں خود بخود باعصمت ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے مومنین کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ۔ (۲۳/۵) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۲۳/۱) ان خصوصیات کے حامل مومن کامیاب ہوں گے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، قوموں کی کامیابی اور ناکامی، ان کے عروج و زوال، ان کی موت و حیات کا دار و مدار جن اسباب و علل پر ہے، ان میں حفاظتِ عصمت کو بنیادی دخل حاصل ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس تک ڈاکٹر اَن وِن اپنی مدت العمر کے تجارب و تحقیقات کے بعد پہنچا ہے۔ دیکھئے! وہ کیسے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:-

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی آشنا ہو۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک

پہنچ جاتی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا، وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ گئی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے رفتگ

میں استنا اور عرض کردوں کہ قرآن کریم نے انسان کے جبلی جذبات کی تسکین پر جو پابندیاں عائد کی ہیں تو ان کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ اس سے اس معاشرہ یا قوم کو کامیابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ان سے فرد متعلقہ کی ذات میں ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ (اسے اخروی زندگی کی خوشگواریاں یا جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ چونکہ اس خطاب میں میرا موضوع یہ ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کی موت و حیات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے میں نے اس گفتگو کو قومی عروج و زوال تک محدود رکھا ہے۔ اس سے فرد کی ذات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے اور جداگانہ بحث کا متقاضی۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے۔

ضبط نفس

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنسی جذبات کی تسکین کا ایک ہی طریق جائز اور صحیح ہے اور وہ ہے عقد نکاح۔ سوال یہ ہے کہ اگر نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا ... (۲۴/۳۳) ـــ جنہیں جب تک نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں، وہ ضبط نفس (Self-control) سے کام لیں۔ اور یہی ہے اس موضوع کا نکتہ ماسکہ۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک نوجوان (لڑکی یا لڑکا) بلوغت کی عمر تک پہنچ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے لئے ضبط نفس ممکن ہے؟ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ کھانے، پینے کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک طبیعی تقاضا ہے، اور دیگر طبیعی تقاضوں کی طرح اس کا پورا کرنا بھی ضروری۔ لہذا ضبط نفس ایک غیر طبیعی یا غیر فطری تقاضا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (Natural Instinct) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے۔ شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو خیر۔ ورنہ اس کی شدت بڑھتی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ سے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی ہے۔ اس سے ہم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل

نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) قرآن کریم میں ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جداگانہ ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور تحریک ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال قرار نہیں دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔

ضبطِ نفس

دیکھئے! اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہے۔ اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے لئے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کو جنسی آوارہ نہ بننے دے اور اس طرف توجہ منعطف نہ کرے تو جنسی جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ خیال کہ اس جذبہ کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے اعصابی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو یہ بھی غلط ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سائیکالوجی کی تحقیقات اس سے بالکل مختلف نتیجہ پر پہنچاتی ہیں۔ ان تحقیقات کی رو سے نہ صرف یہ کہ اس جذبہ پر کنٹرول رکھنے سے کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا، بلکہ اس سے انسان کی تخلیقی صلاحیتیں (Creative potentialities) اس قدر تقویت حاصل کر لیتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جو لوگ پاکیزگی، عفت و نگاہ کی زندگی بطیبِ خاطر بسر کرتے ہیں ان کی انسانی صلاحیتیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ اعصابی عوارض اس وقت لاحق ہوتے ہیں جب انسان اپنے جنسی جذبات کو ابھارتا اور ان میں ہیجان پیدا کرتا ہے اور پھر ان کی تسکین کا فطری طریق اختیار نہ کرے۔ اگر انہیں بیدار ہی نہ کیا جائے تو پھر کسی قسم کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ انسان کی فکر و عمل کی صلاحیتیں نت نئی توانائیاں حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔

تشنیع فواحش

بات یہاں تک پہنچی ہے کہ حفاظتِ عصمت کے لئے ضبطِ نفس ضروری ہے اور ضبطِ نفس اسی صورت میں ممکن ہے کہ جنسی جذبات کو بیدار نہ ہونے دیا جائے۔ ان میں ہیجان برپا نہ ہونے دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس کے لئے کیا طریق تجویز کرتا ہے۔ — وہ عام محاورہ کے مطابق چور کی بجائے چور کی ماں کو مارتا ہے کہ وہ چور کو جنم ہی نہ دے۔ اس کے لئے وہ دو بنیادی طریق تجویز کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ معاشرہ کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ ان تمام دروازوں کو بند کر دے جن سے وہ اسباب و عناصر داخل ہو سکتے ہیں جو جنسی خیالات

کے ابھارنے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ ان اسباب و عناصر کو فحشاء یا فواحش کہہ کر پکارتا ہے۔ انہیں آپ "شہوانیات" کہہ لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۷/۳۳) اے رسولؐ! اعلان کر دو کہ میرے رب نے فواحش کو حرام قرار دے دیا ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ "ظاہری فواحش" کے معنی تو واضح ہیں۔ یعنی شہوانیات کی محسوس و مرئی شکلیں۔ لیکن باطنی فواحش سے مراد وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن کا اثر انسان کے خیالات پر پڑتا ہو اور اس طرح وہ جنسی جذبات میں ہیجان برپا کرنے کا موجب بنتے ہوں۔ قرآن نے انہیں بھی اسی طرح حرام قرار دیا ہے جس طرح (مثلاً) زنا کو حرام قرار دیا ہے۔ اس نے زنا کو بھی فاحشہ کہہ کر پکارا ہے (۱۷/۳۲)۔ وہ معاشرہ میں فواحش پھیلانے والوں کو سنگین ترین جرم کا مرتکب اور شدید ترین سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ۔ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ (۲۴/۱۹) "جو لوگ اسلامی معاشرہ میں فواحش پھیلانا پسند کرتے ہیں اور اس میں لذت لیتے ہیں وہ اس زندگی میں بھی شدید عذاب کے مستحق ہیں اور اخروی زندگی میں بھی۔ فواحش پھیلانا تمہاری نگاہوں میں کچھ ایسا سنگین جرم نہ ہو لیکن خدا اس سے خوب واقف ہے کہ اس کے نتائج کس قدر مضرت رساں ہوتے ہیں"۔ معاشرہ میں کی بے حیائیوں کا موجب وہی خیالات تو بنتے ہیں جو ان فواحش کے عام ہونے سے سینوں میں ابھرتے ہیں۔ مومن ان شہوانیات سے ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔ (۴۲/۳۷)۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ان کے قریب تک بھی نہ جاؤ۔ ان سے اس طرح دور دور رہو جس طرح انسان متعدی امراض سے دور رہتا ہے کہ ان کے قریب جانے سے (Infection) کا خطرہ ہوتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) جنسی جذبہ خیالات سے برانگیخت ہوتا ہے۔

(۲) قرآن کریم ہر اس چیز کے عام کرنے کو جرم قرار دیتا ہے جو ان خیالات کی انگیخت کا موجب بنے۔ ان چیزوں کو وہ فواحش کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں فواحش

یہ ظاہر ہے کہ ہمارے موجودہ معاشرہ میں فواحش کی اشاعت ایک وبائی شکل اختیار کر چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ دنیا میں یہ انداز شروع سے چلا آ رہا ہے کہ بڑے بوڑھے تمام خرابیوں کی ذمہ دار نئی نسل کو ٹھہراتے ہیں اور اس طرح خود فریبی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی روشِ کہن کے مطابق، سال خوردہ طبقہ، اٹھتے بیٹھتے، نوجوان نسل کو کوستا، اور انہیں تمام اخلاقی خرابیوں اور بے حیائیوں کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے جب ہیضہ وبائی شکل اختیار کر جائے تو ہم ہیضہ کے مریضوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ تم اس مرض میں مبتلا کیوں ہو گئے ہو؟ حالانکہ اس سب شتم کے سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ہیضہ کے جراثیم کی روک تھام کا انتظام نہ کیا اور اس طرح وہ

نے صحابہ پھیل کر متعدد شکلیں اختیار کر گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فواحش کے جو جراثیم اس وقت ہمارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں انہوں نے کب سے پھیلنا شروع کیا اور اس کے ذمہ دار کون تھے؟ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ضخیم مجلدات درکار ہوں گی۔ میں اس وقت صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد شعر و ادب کے نام سے جو لٹریچر تخلیق ہوا، اس کا بیشتر حصہ فواحشات پر مبنی تھا اور وہ بھی بڑی ہی پست سطح کی فواحشات پر۔ قوموں کا دورِ انحطاط ایسی شہوانیات کے لئے بڑا سازگار ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے حیات بخش برگ و ساز سے حاصل کردہ حقیقی سرور و انبساط سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ ذہنی عیش سامانیوں کی بھنگ، اور تخیلاتی لذت اندوزیوں کی افیون پر اتر آتی ہے۔ ہمارے دورِ انحطاط میں یہ بھنگ اور افیون عام ہو رہی تھی۔ اس لئے اس دور کا پیدا کردہ شعر و ادب اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہماری شاعری

آپ سو دو سو سال پہلے کی بات چھوڑیئے۔ داغ کا انتقال تو ابھی کل ہوا ہے۔ اس کے ہاں جس قدر عریانی اور فحاشی ہے، وہ اس قدر حیا سوز ہے کہ کسی شریف محفل میں اس کی مثالیں بھی پیش نہیں کی جا سکتیں۔ میرے لئے ایسا کرنا اور بھی مشکل ہے کیونکہ اس محفل میں میری بیٹیاں اور بہنیں بھی موجود ہیں۔ بطور نمونہ آپ اس کا صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیے (لیکن میں اُسے اِس وقت سناؤں گا نہیں۔ جب یہ خطاب مطبوعہ شکل میں آپ کے سامنے آئے گا تو آپ اُس وقت اسے پڑھ لیجئے گا۔) (بلکہ اس انداز کے دیگر اشعار بھی سرِ محفل نہیں سناؤں گا)

مل جائے پہلے مجھ کو، پھر اس کے بعد ابھرے
وہ چیز جو ابھر کر، کرتے ہیں جھول ڈالے

ہماری شاعری میں غزل سب سے زیادہ پرکشش صنفِ سخن ہے۔ غزل کے اقنومِ ثلاثہ کیا ہیں؟ عاشق (یعنی خود جناب شاعر)، معشوق یا محبوب، اور ایک رقیب، جو روسیاہ ہوتا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ جسے محبوب یا معشوق کہا جاتا ہے وہ اپنی بیوی تو ہو نہیں سکتی۔ اکبر تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

لہٰذا، وہ محبوبہ کسی کی بہو، بیٹی یا بہن ہوگی۔ اس محبوبہ کو عام طور پر دو لباسوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایک بازاری عورت کے روپ میں جس کے سینکڑوں چاہنے والے ہوتے ہیں۔ وہ "رات کے وقت مے پیئے، ساتھ رقیب کو لئے" پھرتی رہتی ہے۔ شروع میں تو اسے صرف اپنے لئے مخصوص کر لینے کا داعیہ ہوتا ہے لیکن جب رفتہ رفتہ جذبات ماند پڑ جاتے ہیں یا (غالب کے الفاظ میں) قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، تو مفاہمت کی اس صورت کو بھی غنیمت سمجھا جاتا ہے کہ

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو ۔ ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس کا دوسرا روپ، ایک ناکتخدا، شریف، پردہ نشین جوان لڑکی کا ہوتا ہے جسے ملنے کے راستے میں بڑی

دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان کے ساتھ معاشقہ کی داستانیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق ہمارے زمانے کے ایک جواں مرگ شاعر نے خدا سے کہا تھا کہ میرے اس دفترِ عمل کو سرِ محشر نہ کھولنا، کیونکہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

رند مشرب شعراء کو تو چھوڑیئے، حسرت موہانی جیسا پاک باز، متقی، پرہیزگار، اپنے اس قسم کے معاشقہ کی داستان، اپنی اس غزلِ مسلسل میں، حکایاتی انداز میں بیان کرتا ہے جو بڑی مشہور ہے۔ چند شعر آپ بھی سنئیے۔

چپکے چپکے رات دن، آنسو بہانا یاد ہے / ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صدہزاراں اشتیاق / تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا / اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا / اور ترا دانتوں میں انگلی کا دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً / اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا، / اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف / وہ ترا چوری چھپے، راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کیلئے / وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا / اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

اور مقطع سنیئے کہ

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

جب حسرت جیسا مدعیِ زہد و اتقاء اپنے عہدِ ہوس کے افسانوں کو بایں نمط بیان کرتا ہے تو رندانِ شاہد باز کا کیا ٹھکانہ ہے؟ عشق و محبت کی ان داستانوں میں، ملاقات کے لئے ہمیشہ رات کا وقت رکھا جاتا ہے۔ شبِ وصال ان کی انتہائی منزل ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ جس جس انداز سے کھینچا جاتا ہے، اس سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس رات شاعر کچھ اس کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں، خدا جانے / بچھاؤں پھول یا کلیاں بچھاؤں بستر پر

غالب جیسا فکرِ بلند کا حامل شاعر بھی، پری پیکران سیم بران کو "بہارِ بستر و نورِ آغوش" کہہ کر پکارتا ہے۔ بات کچھ آگے بڑھتی ہے تو کہتا ہے کہ

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور تو اور، ریاض خیر آبادی جیسا خضر صورت، تہجد گزار بھی ان راتوں کا ماجرا کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ

شب وصل چھیڑا تو جھنجھلا کے بولے　　　یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟

وہ "یہ کیا کر رہے ہو" کو بلا تفصیل نہیں چھوڑتا۔ بلا حجاب کہتا ہے کہ

یار کے بند قبا آہستہ وا کرنے لگے　　　چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کرنے لگے

ریاضؔ تو "بند قبا وا کرنے" پر اکتفا کرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی لگی لپٹی رکھے بغیر بہت دور آگے تک پہنچ جاتا ہے لیکن میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حیا بڑی سختی سے عناں گیر ہو جاتی ہے۔

مجھے ندامت ہے عزیزانِ من! کہ مجھے سر محفل اس قسم کے اشعار پیش کرنے پڑ رہے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے — بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر۔

جب وہ محبوب غیر کے ہاں کی شب بسری کے بعد واپس آتا ہے تو وہ ماجرائے شب کے متعلق غلط بیانی سے کام لینا چاہتا ہے لیکن اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ اس انکار و اخفاء سے کیا حاصل؟

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

یہاں تک ہی نہیں۔ اس سے دو ٹوک الفاظ میں پوچھا جاتا ہے کہ

کس کے آغوش نے کھینچا ہے تجھے تنگ کہ آج　　　تیری تصویر سے ملتی نہیں صورت تیری

اُس پر ندامت طاری ہو جاتی ہے تو کہا جاتا ہے "خیر! کوئی بات نہیں"

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے　　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

وہ اگر پردہ نشین ہے اور بیٹی بیٹا اس گھر سے نکلتی ہے تو پیچھے سے آواز دی جاتی ہے کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من انداز قدت را می شناسم

ہم انگلستان کے حالیہ قانون کو بڑی حیرت اور انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اختلاطِ ہم جنسی (Homo-sexuality) کو قانوناً جائز قرار دیدیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ روش بڑی قدیم ہے اور اسے بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کی ندی کا سرچشمہ فارسی شاعری ہے اور فارسی شاعری کی ساری عمارت امرد پرستی پر استوار ہوتی ہے۔ وہاں محبوب ہوتے ہی "مُغ بچے" ہیں۔ وہاں سے یہ جراثیم ہماری شاعری میں بھی در آئے۔ چنانچہ میرتقی جیسا صاحب سوز و گداز اُس "عطار کے لونڈے" سے دوا لیتا ہے جس نے اسے بیمار کر رکھا ہے۔ غالب کے ہاں اس باب میں مگر کی بھی کوئی قید نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

(۱)

میں نے عزیزانِ من! اپنے ہاں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی فحاشیات کا یونہی سرسری سا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی اشارات و کنایات میں۔ اگر میں اس کی دیگر اصناف (افسانے، ڈرامے وغیرہ) کا بھی ذکر کرتا، تو ہماری اس شستہ و شائستہ محفل کی فضا تعفن سے بھر جاتی۔ بہرحال، یہ ہے ہمارا وہ ادبی ترکہ اور سرمایہ جسے ہم نے

(لہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸ کے نیچے ملاحظہ ہو)

اپنی نئی نسل کو دیا ہے۔ اس کے بعد ایک تو زمانہ بے حجابی کا آ گیا جس میں یہ عالم دیدار یار ہونے لگا۔ دوسرے ذرائع ابلاغ اور اسباب نشر و اشاعت (ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔ پریس وغیرہ) اس قدر عام اور وسیع ہو گئے کہ معاشرہ کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جس تک یہ جراثیم نہ پہنچ گئے ہوں۔ قرآن کریم نے کسی دور کے ستر کو مستقبل ہوا کہہ کر پکارا ہے ([illegible])۔ یعنی وہ ستر جو اگر دوسروں تک پہنچ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے شاید ہمارے ہی دور کا ستر مراد ہے کہ اس سے آپ کتنا ہی بچنا چاہیں یہ آپ تک بالآخر پہنچ جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ ہماری نئی نسل کے نوجوان جو اس فضا میں پرورش پائیں وہ ان فحاشیات سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ یوں تو ہمارا سارا ہی قدامت پرست طبقہ ان نوجوانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے لیکن مذہب پرست طبقہ ان بیچاروں کو جینے ہی نہیں دیتا۔ وہ معاشرہ کی ساری بدنہادی اور بے راہ روی کا ذمہ دار انہی کو ٹھہراتا ہے۔ اور اٹھتے بیٹھتے کہتا رہتا ہے کہ مغرب کی تعلیم نے انہیں تباہ کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے غلط نظام اور فضا سب تعلیم کا اس میں بڑا حصہ ہے لیکن ہمارے مکتبوں اور دارالعلوموں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے

دارالعلوموں کی تعلیم

اس میں جنسی جذبات کی برانگیختگی کا جس قدر سامان ہوتا ہے اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آپ فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں زن و مرد کے تعلقات کے سلسلہ میں جو مسائل ملیں گے، ان کی عریانیت ناقابل برداشت ہوگی۔ میں نے اپنے ہاں کی شاعری کی تو بعض مثالیں بصد معذرت پیش کر دی ہیں، کتب فقہ کے ان مسائل کا اشارۃً اور کنایۃً ذکر کرنا بھی میرے لئے ممکن نہیں۔ آپ زیادہ نہیں تو کم از کم ہدایہ یا درِ مختار میں باب الغسل یا باب الصوم کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں "مسائل" کے نام سے کیا کچھ لکھا ملتا ہے۔ اور وہ نوجوان طالب علموں کے جنسی جذبات میں (جو بالعموم غیر شادی شدہ ہوتے ہیں) کس قدر ہیجان برپا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

فقہ سے آگے بڑھ کر قرآن و حدیث کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں ان دارالعلوموں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت ہے نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ۔ (۲/۲۲۳) اس کا

ل حاشیہ صفحہ (۱) میرا مطلب یہ نہیں کہ شعر و ادب کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو ڈھونڈ کر انہیں وعظ بنا دیا جائے اور شعر کچھ اس قسم کے کہے جانے لگیں کہ۔

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اس کے بُرا مانتا ہے

میرا مطلب یہ ہے کہ شعر و ادب کو عریانیت اور فحاشیت سے پاک اور صاف رکھا جائے۔ ایسے حسین اور وقیع الفاظ میں پیش کیا جائے جس سے تولیدی (جنسی) جذبات میں ہیجان انگیزی کی بجائے تخلیقی صلاحیتوں کی نمود ہو۔ اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "تمہاری بیویاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ بس تم اپنی کھیتی میں جس طرح بھی چاہو جاؤ"[1]
صحیح بخاری، کتاب التفسیر میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "بعض آدمی عورتوں سے اغلام کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔" اس سے یہ بحث چل پڑی کہ بیوی کے ساتھ وطی فی الدبر (مقعد میں جماع) جائز ہے یا نہیں۔ علامہ بدرالدین عینیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بخاری کی شرحیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بخاری کی اس تفسیر پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور اس باب میں مختلف ائمہ کے اقوال اور مسالک بیان کئے ہیں۔ مثال کے طور پر امام مالکؒ کے متعلق علامہ عینی نے لکھا ہے۔

> محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالکؒ بن انس کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے کہ میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں پایا جس کا دین کے بارے میں پیروی اور اقتدا کروں اور وہ اس کے حلال ہونے کے بارے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت کے ساتھ دُبر میں جماع کرنے کے بارے میں[2]

یہ ہے ایک مثال قرآنی آیات کی اس تفسیر کی جو احادیث کی رو سے ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب ان درسگاہوں کے نوجوانوں میں ایسی تفسیروں پڑھتیں ہوتی ہوں گی تو ان سے ان کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہو گی؟ یا ایسی روایات پڑھتیں جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ

> رسول اللہ نے فرمایا کہ حضرت سلیمانؑ کی سو (یا ننانوے) بیویاں تھیں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ آج رات کو میں ان عورتوں کے پاس جاؤں گا اور وہ سب ایک ایک شاہ سوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کریں گے۔ ان کے ہم نشینوں نے کہا کہ انشاء اللہ کہو۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کہا تو ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی سو وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو (سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور) بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد)

---- (۵) ----

مودودی صاحب کی تعلیم

یہ ہماری قدامت پرست درسگاہوں میں دی جانے والی تعلیم کی چند ایک مثالیں ہیں۔ ہمارے

---

[1] اس کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے اور یہی ترجمہ میرے نزدیک زیادہ موزوں ہے یعنی "تم اپنی کھیتی میں جب جی چاہے جاؤ۔" یعنی عندالضرورت جاؤ۔ [2] اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے "مقام حدیث" کا شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام عنوان "قرآنی آیات کی تفسیر احادیث کی رو سے"۔

کالجوں کے طلبا کا ایک کثیر طبقہ جماعت اسلامی کے زیر اثر ہے۔ آپ دیکھئے کہ ان کے ہاں جنسیات کے سلسلہ میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مودودی صاحب بڑی شد و مد سے اس کا پرچار کرتے ہیں کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں۔

> حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔
>
> (تفہیم القرآن - جلد اول - پہلا ایڈیشن - صفحہ ۳۱۲)

اس بحث کو انہوں نے اپنی کتاب 'تفہیمات' حصہ دوم میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے۔

(۱) لونڈیوں سے بلا نکاح جنسی اختلاط کیا جا سکتا ہے۔

(۲) لونڈیوں کی تعداد پر کوئی قید نہیں۔

(۳) ان کے مالک جب چاہیں انہیں دوسروں کی طرف منتقل بھی کر سکتے ہیں اور فروخت بھی کر سکتے ہیں[1]

(تفہیمات، حصہ دوم صفحہ ۲۹۰-۳۲۴)

(ضمناً آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان کی مجلس دستور ساز کے ۱۹۵۰ء کے موسم بہار کے سیشن میں جمعیت العلماء اسلام کے رکن اسمبلی مولانا نعمت اللہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ:

> غلامی کو منسوخ کرنا خلاف اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔
>
> (بحوالہ پاکستان ٹائمز - یکم مارچ ۱۹۵۰ء)

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ مودودی صاحب کے ہاں سے نوجوانوں کو کس قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اگر ایک نوجوان کی شادی کا انتظام نہ ہو سکتا ہو، اس کا شباب عروج پر ہو تو کیا وہ زنا سے بچنے کے لئے "اپنے ہاتھ سے کام لے سکتا ہے"؟ قبل اس کے کہ ہم مودودی صاحب کا جواب آپ کے سامنے لائیں، آپ کو یاد دلا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس سوال کا جواب پہلے ہی سے موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا ..... (۲۴/۳۳) "جو لوگ نکاح کی طاقت نہ پا سکیں وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔" اس سوال کے جواب میں مودودی صاحب نے بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد کہا ہے کہ

> ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل (یعنی Mastarbation - مرتب) حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور عمل لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبیعت کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق

---

[1] تفصیلی بحث آپ کو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ [illegible] اسلام اور لونڈیاں میں ملے گی۔

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔"

(رسائل و مسائل - جلد دوم - صفحہ ۲۵۶)

یعنی یہ فعل تو حرام ہے لیکن عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ ......

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ سوال ابھرتا ہوگا کہ مودودی صاحب نے سورۂ نور کی اس آیت کے متعلق بھی کچھ کہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت کے لئے صرف ایک ہی صورت بتائی ہے اور وہ یہ کہ ضبطِ نفس سے کام لے - مودودی صاحب نے اس آیت کو لکھا ہے لیکن اس کے ترجمہ میں اپنے مطلب کے لئے گنجائش نکال لی ہے۔ انہوں نے آیت مع ترجمہ اس طرح لکھی ہے:۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (النور - ۳۳)

اور چاہیئے کہ وہ لوگ باعفت رہنے کی کوشش کریں جو نکاح کا موقعہ نہیں پاتے۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔ (ایضاً)

شاہ رفیع الدینؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں "اور چاہیئے کہ پاکدامنی کریں وہ لوگ کہ نہیں مقدور پاتے نکاح کا"۔ مولانا محمود الحسنؒ کا ترجمہ یہ ہے۔ "اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ پاکدامن رہیں۔ اپنے آپ کو تھامے رہیں۔ ضبطِ نفس سے کام لیں اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ باعفت رہنے کی کوشش کریں۔ یعنی وہ اپنی طرف سے باعفت رہنے کی کوشش کریں۔ اس میں کامیاب ہو جائیں تو فبہا ورنہ اس فعل کو اختیار کرلیں جسے خود مودودی صاحب کے الفاظ میں "خدا نے حرام قرار دیا ہے"۔

یہ تو اس صورت میں ہوا جب اس نوجوان کو کوئی عورت نہ مل سکے۔ لیکن اگر عورت میسر آ سکے مگر اس سے "شرعی نکاح" کی صورت ممکن نہ ہو، تو پھر کیا کیا جائے۔ پھر عارضی نکاح کر لیا جائے جسے متعہ کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بیٹھے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر بھی مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کرلیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں، یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن - اگست ۱۹۵۵ء)

یعنی مودودی صاحب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جنسی جذبہ پہ کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔ شہوت رانی کے لئے وہ کبھی استمنا بالید (Masterbation) جیسے فعل حرام کو اختیار کر لینا، اضطراری حالت قرار

دیتے ہیں، اور کبھی متعہ کو جائز۔ اللہ تعالیٰ نے صرف کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق کہا تھا کہ اضطراری حالت میں حرام چیز کے کھانے کی اجازت ہے۔ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ لیکن مودودی صاحب اضطراری حالتوں میں اس جذبہ کی تسکین کی صورتیں تجویز فرما رہے ہیں اور انہیں جائز قرار دے رہے ہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کو اس کا علم نہیں تھا کہ جنسی جذبہ کی صورت میں اضطراری کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس نے اس کے مداوا کی کوئی شکل نہ بتائی۔ یہ کمی مودودی صاحب نے پوری کر دی۔

اور آگے بڑھئیے

یہ ہے وہ تعلیم جو ہمارے ان نوجوانوں کو دی جاتی ہے جو کالجوں کی جراثیم آلودہ فضا سے بچنے کے لئے مذہب کی مقدس اور پاکیزہ آماجگاہ میں پناہ لینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ جنسیات کے سلسلہ میں وہ ان نوجوانوں کو اور بھی بہت کچھ بتاتے ہیں۔ (مثلاً) ایک مرد بیک وقت چار عورتوں سے شادیاں بلا محابا کر سکتا ہے۔ پھر ان میں سے جسے، جس وقت جی چاہے ایک، دو، تین کہہ کر طلاق دے سکتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری عورت حبالۂ نکاح میں لا سکتا ہے (The Making Of Humanity) کے مشہور مصنف رابرٹ بریفالٹ نے عورتوں کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے (The Mother)۔ اس میں وہ ایک کُرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی عورت سے شادی کی۔ لیکن وہ قریب چالیس عورتیں بدل چکا تھا۔ ہمارے ارباب شریعت کے نزدیک اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ مودودی صاحب نے عائلی قوانین کے خلاف جو اس قدر طوفان برپا کیا تھا تو وہ اسی بنا پر تھا کہ جس جنسی آزادی کا لائسنس ہم دیتے ہیں اس پر حکومت کس طرح پابندی لگا سکتی ہے؟ انہی پابندیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے خلاف مودودی صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ

> کم سنی کی عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۷۰ء)

کم سن بیویوں کے ساتھ خلوت اس کی اجازت انہی کے ہاں سے مل سکتی ہے جن کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ۔۔۔ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار ۔۔۔ یہ حضرات اس کی تائید میں یہ سند لایا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ میں نے بدلائل واسناد یہ ثابت کیا کہ یہ دشمنوں کی طرف سے وضع کردہ افسانہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی (میں جو کچھ کہ رہا ہوں اس کا فیصلہ ابھی آگے ہوگا)۔ اس کی ایک بنیاد

یہ بھی کہ میں نے ایسا کیوں کہا ہے جس سے بخاری کی ایک روایت پر زد پڑتی ہے۔ یعنی حضور رسالتمآب کی ذاتِ اقدس پر زد پڑتی ہے تو کچھ مضائقہ نہیں، بخاری کی روایت پر زد نہیں پڑنی چاہیئے۔ یا للعجب!)

قرآن کریم نے جنت کا تصور بڑا بلند اور لطیف و نظیف پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بیان تمثیلی ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک اس کی فضا بھی جنسیات سے مملو ہے۔ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی پانچویں جلد میں لکھتے ہیں کہ۔

> دنیا کی زندگی میں کوئی عورت جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر، آخرت میں یہ سب نیک خواتین جنت میں داخل ہوں گی تو نوجوان اور کنواری بنا دی جائیں گی۔ (ص ۲۷۸)

جنت کی حوروں کے متعلق ارشاد ہے کہ

> کفار کی وہ لڑکیاں جو سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں، انہیں حوریں بنا دیا جائیگا اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں رہیں گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ ص ۲۸۵)
> (نیز۔ ایشیا۔ ۲۴ جون)

> یہ حوریں بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔ بیویاں جنتی مردوں کے ساتھ محلات میں رہیں گی لیکن جب وہ پکنک منانے کے لئے باہر جائیں گے تو ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔
> (تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ ص ۲۳۵)

یہ ہے وہ جنت جس کی جھلک دکھا کر یہ حضرات، نوجوانوں کو "قائل بہ اسلام" کرتے ہیں!

(۰)

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نوجوانوں کو جو مشرقی ادب پڑھنے کو دیا جاتا ہے، وہ جنسیات سے بھرپور ہوتا ہے، اور جو لٹریچر مغرب سے امنڈ کر آتا ہے وہ بھی فحاشیات سے لبالب بھرا ہوتا ہے۔

ہمارے مکتبوں اور دار العلوموں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس میں بھی جنسی جذبات کی برانگیختگی کا کافی سامان ہوتا ہے۔ اور

جو نوجوان "ماڈرن اسلام" کی طرف آتے ہیں، انہیں بھی اسی قسم کی ہیجان خیز تعلیم دی جاتی ہے۔

اور اس کے بعد ہر شخص نالاں ہے کہ یہاں فحاشی عام ہو رہی ہے۔ اگر ان حالات میں فحاشی عام نہ ہو تو اور کیا ہو؟ پارسائی عام ہو!!

جو قوم اس قسم کی جنس آلودہ مسموم فضا میں صدیوں سے زندگی بسر کر رہی ہو، اس کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر راؤن کی تحقیقات کے نتائج غور سے سننے کے قابل ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی

جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندگی بسند معاشی ملائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر اوفن نے ان تمام توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو تعویذ، گنڈہ، تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات' اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ نماز کا سامان پر کسی طرح اضافہ نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں[۲]

(صفحات ۴۶-۳۴۵)

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی۔ اور یہی حالت اس وقت چلی جا رہی ہے۔

حرفِ آخر

آخر میں' میں اپنی قوم کے نونہالوں کو براہ راست مخاطب کرنا' اور ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں شبہ

---

[۱] (حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

[۲] (یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اسی طرح کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

ہیں کہ ہماری فضا ان جراثیم سے بھرپور ہو چکی ہے جو جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ لیکن آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جنسی جذبات از خود کبھی نہیں ابھرتے۔ یہ انسان کے اپنے خیالات سے ابھرتے ہیں یعنی یہ اُس وقت ابھرتے ہیں جب آپ خود انہیں ابھارنا چاہیں۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فطرت کی طرف سے انسان کو ایسی بے پناہ قوتِ ارادی عطا کی گئی ہے کہ اس کے تمام خیالات اور خواہشات اسکے تابع رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ یہ نہ دیکھئے کہ فضا کس قدر زہر آلود ہے۔ آپ اپنی قوتِ ارادی سے کام لیجئے اور اپنے خیالات کو اس فضا سے متاثر نہ ہونے دیجئے۔ جنسی جذبہ کس طرح خیالات کے تابع رہتا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک آوارہ بدنہاد جنسیات میں ڈوبا ہوا نوجوان ہے جو کسی لڑکی پر بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں چوکتا۔ اس کی ایک ہمشیرہ ہے، نوجوان۔ بڑی خوبصورت، ناکتخدا۔ وہ دونوں تنہا ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہیں راتوں کو تنہا سوتے ہیں۔ لڑکی ہونے کی جہت سے، اس لڑکی اور اُن لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں جن کے پیچھے یہ مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ لیکن وہ اس لڑکی کی طرف جو اس کی بہن ہے کبھی نگاہ سے دیکھتا تک نہیں۔ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ بچپن سے اس کے کان میں یہ آواز پڑتی چلی آئی ہے کہ بہن کے ساتھ جنسی تعلق جائز نہیں۔ بچپن سے اس کے کان میں یہ آواز پڑتی چلی آرہی ہے۔ اور اس نے ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکی (یعنی بہن) کے حوالے سے جنسی جذبہ کا خیال تک اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ ساری عمر نہیں ابھرتا[1]۔ یہ چیز ہمارے معاشرہ تک ہی محدود نہیں۔ یورپ کا معاشرہ جس میں جنسیات، حیوانیت سے بھی پست سطح پر پہنچ چکی ہے، وہاں بھی اس کی غیر شعوری تعلیم و تربیت کا نتیجہ ایسا ہی مرتب ہوتا ہے۔ کچھ سال ادھر کا ذکر ہے اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا قصہ شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتا تھا۔ ان کے نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ لڑائی کے دوران انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کینیڈا کا کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ساتھ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی ہے، اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہے۔ اتفاق سے وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی (جو اب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی اور برسوں تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گذری، اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اخبارات

---

[1] بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ اپنی بیٹیوں، بہنوں پر بھی دست درازی کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ غیر معمولی واقعات نفسیاتی پاگل پن کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عام انسان ایسا نہیں کرتے۔

کر دیئے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال، پادریوں نے ان کی تسلی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بھائی بہن، میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ حالانکہ ایران کے زرتشتی شہنشاہ کھلے بندوں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کی وہ بے پناہ قوت جو جذبات پر نہایت آسانی سے، بلکہ غیر شعوری طور پر کنٹرول کر لیتی ہے۔

یہ مثال حقیقی بہن بھائیوں کی ہے۔ قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہی نہیں، ہر لڑکے اور لڑکی کے باہمی تعلق بہن بھائیوں کے سے ہیں، اور ان میں تبدیلی صرف اس صورت میں آتی ہے جب کسی لڑکے اور لڑکی میں نکاح ہو جائے۔ آپ نے کبھی اس نکتہ پر بھی غور کیا ہے کہ اسی لئے جب یہ کہا ہے کہ انما المؤمنون اخوۃ (۴۹/۱۰) تو اس سے مراد یہی نہیں کہ مومن مردوں کا باہمی تعلق بھائی بھائیوں کا سا ہے۔ اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ مومن عورتوں اور مردوں کا باہمی تعلق بھی بہن بھائیوں کا سا ہے (بجز ان کے جن کے ساتھ نکاح ہو جائے)۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم تو ہمارے دلوں سے محو ہو چکی ہے لیکن اس کے دھندلے سے نقوش ابھی کل تک ہمارے معاشرے میں باقی تھے۔ بعض گھرانوں میں ان کے نشانات ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ بات چونکہ پنجابی گھروں کی ہے اس لئے اسے اسی زبان میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ باہر کوئی اجنبی مرد دستک دیتا ہے تو لڑکی — خواہ بچی ہو خواہ جوان — اندر آ کر ماں سے کہتی ہے کہ "اماں! باہر اک بھائی آیا اے، پچھدا اے تیرا ابا کتھے اے؟" یا مثلاً لڑکیاں بلکہ عورتیں تک آپس میں یوں باتیں کرتی ہیں کہ "ہم جو وہاں گئی ہیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ اوتھے کنے سارے بھائی بیٹھے ہوئے سن"۔ یعنی ہمارے معاشرہ میں اجنبی مردوں کو بھائی ہی کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے خیالات ہمارے معاشرہ میں اب بھی عام کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق کرنا سیکھ جائیں۔ حیوانی زندگی میں جنسی جذبات کی تسکین بلا حدود و قیود ہوتی ہے، انسانی زندگی میں ان کی تسکین ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جا سکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ اگر آپ نے اس فرق کو سمجھ کر اپنے جنسی جذبات کو اپنے خیالات کے تابع کر لیا تو آپ فضا میں پھیلے ہوئے جراثیم سے قطعاً متاثر نہیں ہونگے۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا، اس کے متعلق مجھ سے نہیں، ڈاکٹر انون سے پوچھئے جس نے اپنی کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے۔

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک بلکہ ابدالآباد تک قائم اور بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے، یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جس سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کر دیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔ (ص ۳۸۲)

والسلام

باب المراسلات

لاہوری "احمدیوں" کا ایک استدلال

ایک صاحب لکھتے ہیں :-

لاہوری احمدی عام طور پر کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا - جو شخص تمہیں السلام علیکم کہے اسے یہ مت کہو کہ تم مسلمان نہیں - کافر ہو - ہم السلام علیکم کہتے ہیں - اس لئے ہمیں کافر قرار دینا قرآن شریف کے حکم کے خلاف ہے - آپ براہ کرم بتائیں کہ یہ کہاں تک ٹھیک ہے؟

طلوع اسلام : آپ نے اس بے نمازی کا قصہ تو سنا ہوگا جو لوگوں سے کہتا تھا کہ قرآن شریف میں آیا ہے، کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ - نماز کے قریب مت جاؤ - اس لئے میں نماز نہیں پڑھتا - یعنی وہ قرآن مجید کی آیت "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى" "تم نماز کے قریب مت جاؤ جب کہ تم حالت نشہ میں ہو" میں سے آخری الفاظ (وَاَنْتُمْ سُكَارٰى) حذف کر دیتا تھا اور صرف پہلا حصہ اپنے ترکِ صلوٰۃ کے جواز میں پیش کر دیتا تھا - یہی ٹیکنیک ان حضرات کی بھی ہے - یہ مرزا صاحب کے لٹریچر سے صرف انہی اقوال کو پیش کریں گے جو ان کے مفید مطلب ہوں اور ان اقوال کا ذکر تک نہیں کریں گے جو ان کے خلاف جائیں - یہی روش یہ لوگ قرآن مجید کی آیات میں بھی اختیار کرتے ہیں - جس آیت میں سے یہ اوپر کا ٹکڑا پیش کرتے ہیں وہ (پوری آیت یوں ہے -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴/۹۴)

پوری آیت کا ترجمہ اور مفہوم بعد میں لکھا جائے گا - اس کے شروع کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :-

اے جماعت مومنین! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو -

آیت کے اتنے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس میں جنگ سے متعلق کچھ ہدایات دی گئی ہیں - آیت کے بعد کے الفاظ میں کہا گیا ہے کہ "كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ - فَتَبَيَّنُوْا - تم اس سے پہلے (اسلام لانے سے پہلے زمانہ جاہلیت میں) ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اللہ نے تم پر احسان کیا جو اس قسم کی ہدایت دے کر تمہاری سابقہ روش کی اصلاح کر دی -

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ان لوگوں کی وہ کون سی روش تھی جس کی اصلاح مقصود تھی - زمانہ جاہلیت میں ان لوگوں کے لئے جنگ کا جذبہ محرکہ مالِ غنیمت کا حصول تھا اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں

حاصل ہو سکتا تھا جب دشمن پر غلبہ پا لیا جائے۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ دشمن مغلوب ہونے سے پہلے ہی صلح کی پیش کش کر دیتا تو یہ اسے مسترد کر دیتے۔ کیونکہ یہ سمجھتے کہ اس طرح مالِ غنیمت حاصل نہیں ہو سکے گا۔

قرآن کریم نے جنگ کا جذبہ محرکہ ہی بدل دیا اور کہا کہ جہاد کا مقصد نہ مالِ غنیمت ہے نہ رجوع الارض۔ اس کا مقصد ہے "وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا" (۹/۴۰) خدا کے نظام و قانون کا بلند کرنا۔ لہٰذا اگر جنگ کے دوران دشمن کسی وقت بھی صلح کا پیش کش کرے تو تم اس خیال سے کہ اب وہ کمزور ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم جنگ جاری رکھ کر مالِ غنیمت کیوں نہ حاصل کر لیں، اس کی پیش کش کو مسترد نہ کر دو، جنگ بند کرو۔ اس کے عزائم کی تحقیق کرو۔ اور اگر دیکھو کہ وہ فی الواقعہ صلح کا خواہاں ہے تو اس سے معاہدہ کر لو۔ تمہارا مقصد تو نظامِ خداوندی کی مخالف قوتوں کو کمزور کرنا ہے جب ان سے ایسا ہو جائے تو پھر جنگ کیوں کی جائے؟ چنانچہ اس نے سورۃ انفال میں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:۔ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۔ (۸/۶۱-۶۲) اگر دشمن صلح کے لئے آمادہ ہو جائے تو تم بھی صلح کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اپنے مقصد کی صداقت پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے اور اس پیش کش سے دشمن کا ارادہ دھوکہ دینے کا ہو گا تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ خدا کی تائید و نصرت تمہارے لئے کافی ہو گی۔

اس پس منظر میں اب آیئے سورۃ النساء کی متعلقہ آیت کی طرف، جسے ہم نے پہلے درج کر دیا ہے (یعنی آیت ۹۴/۴ کی طرف) اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم جنگ کے لئے نکلو تو پوری بالتحقیق و تفتیش جذباتی طور پر فیصلے نہ کر لیا کرو (مثلاً) وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۔ اس میں "لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ" کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص یا قوم تمہیں اسلام علیکم کہے۔ "سلام" کے بنیادی معنی ہیں۔ امن، سلامتی، صلح (PEACE) اطاعت۔ لہٰذا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ کے معنی ہیں جو شخص (قبیلہ، گروہ، دشمن کا لشکر) صلح کی پیش کش یا اطاعت پذیری کا اظہار کرے تو تمہارا فوری ردِ عمل (FIRST REACTION) یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ نہیں، تم اس پیش کش میں سچے نہیں ہو، تم دھوکا دینا چاہتے ہو، ہم تم پر بھروسہ نہیں کر سکتے، تم امن کے خواہاں نہیں ہو ہم تمہیں امن کی ضمانت دینے والا نہیں سمجھتے۔ "لَسْتَ مُؤْمِنًا" میں یہ سب مفہوم آ جاتا ہے جس طرح سلام کے بنیادی معنی امن، صلح اور سلامتی کے ہیں۔ اسی طرح امن (جس سے لفظ مومن آیا ہے) کے معنی امن، اعتماد، بھروسہ وغیرہ ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہے جو دوسروں کو اپنی ضمانت دے جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ جو امن کا ذمہ دار ہو۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "اَلْمُؤْمِنُ" ہے (۵۹/۲۳) خود جماعت لاہور کے سابق امیر (مولانا محمد علی) اس کا ترجمہ "امن دینے والا" کرتے ہیں۔

اس کے بعد کہا کہ تم فریقِ مقابل کی صلح کی پیش کش کو اس لئے مسترد کر دینا چاہتے ہو کہ اس سے تمہیں مالِ غنیمت حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ایسا نہ کرو۔ اللہ کے ہاں سے تمہیں اس قدر مال و دولت ملے گا کہ تم اسے سنبھال نہ سکو گے۔ لہٰذا تم اس کی صلح کی پیش کش کو قبول کر لو۔ اور اس کے بعد فَتَبَيَّنُوا تحقیق کرو۔ اور اگر بعد از تحقیق معلوم ہو جائے کہ وہ فی الواقعہ امن کا خواہاں ہے تو اس سے باقاعدہ معاہدہ کر لو۔ یا اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن کی جماعت کا فرد

ہے ہی نہیں، تمہیں میں سے ہی ہے، تو پھر اس سے معاہدہ کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔

یہ ہے وہ ہدایت جو جنگ کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جماعتِ مؤمنین کو دی۔ اس کے بعد آپ خود ہی سوچئے کہ کیا اس آیت کا اس مقصد سے کچھ بھی تعلق ہے جس کے لئے یہ حضرات (لاہوری احمدی) اسے پیش کرتے رہتے ہیں یعنی یہ مقصد کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص السلام علیکم کہے، تم اسے غیر مسلم مت قرار دو" لہٰذا حکومتِ پاکستان کا یہ فیصلہ کہ یہ لوگ غیر مسلم ہیں قرآن کے خلاف ہے۔

کفر اور اسلام زندگی کی دو بنیادی حقیقتیں ہیں۔ آپ سوچئے کہ کیا ان اہم بنیادی حقیقتوں کے فیصلہ کا معیار اور مدار صرف اتنا ہوگا کہ جو شخص بھی السلام علیکم کہہ دے تم اسے مسلمان تسلیم کرلو۔ کتنے ہندو، عیسائی، پارسی وغیرہ غیر مسلم ہیں جو محض آدابِ معاشرت میں کشادہ ظرفی کی خاطر مسلمانوں کو "آدابِ عرض" کی بجائے السلام علیکم کہہ دیتے ہیں۔ کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ انہیں کافر نہ کہا جائے، مسلمان تسلیم کر لیا جائے؟ لیکن بعض اوقات فطرت کی ستم ظریفی بڑی تعجب انگیز ہوتی ہے۔ یہ لوگ "اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ" کا ترجمہ کرتے ہیں جو شخص تمہیں السلام علیکم کہے اور اسی بنیاد پر ان کے دعوے کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی جماعت کے ترجمان "پیغام صلح" کی ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں "تکفیرِ مسلم کی حیثیت" کے عنوان سے مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (دیوبندی) کا ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر قرار دینے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ اس میں سب سے پہلے قرآن کریم کی یہی آیت درج ہے اور اس کے الفاظ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ کا ترجمہ دیا گیا ہے "ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے (ترجمہ مولانا تھانوی) آپ دیکھئے کہ ان الفاظ کے اس ترجمہ سے ان حضرات کے دعویٰ کی ساری عمارت کس طرح دھڑام سے زمین پر آگرتی ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے جو ہم نے آیت کا مفہوم سمجھانے کے لئے کیا ہے۔

اور اگر بفرضِ محال اس کے معنی یہی کئے جائیں کہ "جو شخص تمہیں السلام علیکم کہے۔ اسے کافر مت کہو" تو ان سے پوچھئے کہ اس آیت میں جو ایک جگہ چھوڑ دو جگہ فَتَبَیَّنُوْٓا کہا گیا ہے (یعنی تحقیق کر لیا کرو) تو اس سے کیا مراد ہے؟ کیا حکومت نے انہیں تحقیق کے بعد کافر قرار نہیں دیا؟

ان حضرات سے یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ مرزا صاحب جو اپنی دعوت کے نہ ماننے والے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے رہے۔ کیا وہ (مسلمان) السلام علیکم کہنے والے نہیں تھے؟

لاہوری جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے، مسیح موعود مانتے ہیں اور جو شخص انہیں مسیح موعود نہیں مانتا اسے ہم کافر نہیں قرار دیتے، لیکن دیکھئے کہ اس باب میں مرزا صاحب کیا فرماتے ہیں وہ اپنی کتاب "حقیقت الوحی" میں کہتے ہیں:-

"کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے۔ اور آنحضرتؐ کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمامِ حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے

نبیوں کی کتابوں میں بھی تائید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم کے کفر میں داخل ہیں" (صفحہ ۱۷۹)

مرزا صاحب کے اس دعوے کی روشنی میں دیکھئے کہ لاہوری جماعت کا یہ دعویٰ کہ مرزا صاحب کو مسیح موعود نہ ماننے سے کوئی شخص کافر نہیں ہوگا کس قدر فریب دہی ہے۔

اور آخر میں وہ حقیقت جسے پرویز صاحب نے اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں قولِ فیصل کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ مرزا صاحب کا فیصلہ ہے جسے لاہوری جماعت بار بار دہراتی رہی ہے کہ:-

"ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائط اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور نہ کم ہو سکتا ہے جو احکام قرآنی کی ترمیم و تنسیخ یا کسی حکم کی تبدیلی یا تغیر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے" (ازالۂ اوہام صفحہ ۱۳۸)

اس کے بعد مرزا صاحب کے اس دعویٰ کو سامنے لائیے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:-

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم سے بند کیا گیا ہے۔ (اربعین ۴)

اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے جہاد بالسیف کو حرام قرار دیا، یعنی انہوں نے قرآن کریم کے ایک ایسے واضح حکم کو جسے اس نے بے شمار مقامات پر دہرایا ہے، منسوخ اور حرام قرار دیا ہے۔

فرمائیے کہ کیا اس دعوے کے بعد مرزا صاحب خود اپنے قول کے مطابق "جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر" قرار نہیں پاتے۔

اور جو جماعت اس کے باوجود انہیں مجدد اور مامور من اللہ مانتی ہے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتی کیا ان لوگوں کو محض اس لئے مسلمان تسلیم کر لیا جائے کہ وہ "السلام علیکم" کہتے ہیں۔

۲- عبدالحمید صدیقی صاحب

ہم نے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں سنت رسول اللہ کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کئے تھے اور ماہنامہ ترجمان القرآن کے مدیر اشارات محترم عبدالحمید صدیقی صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ بتائیں کہ ان کے اپنے مقرر کردہ اصول کے مطابق مودودی صاحب متبع سنت قرار پاتے ہیں یا منکر سنت ہمیں قارئین کی طرف سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ کیا صدیقی صاحب نے اس کے جواب میں کچھ شائع کیا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ صدیقی صاحب نے اس سلسلہ میں نہ ابھی کچھ لکھا ہے اور نہ ہی اپنے رسالہ ترجمان القرآن کی دسمبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں کچھ شائع کیا ہے! یہ حضرات جانتے ہیں کہ مودودی صاحب کے خلاف کلمۂ حق لکھنے کی پاداش کیا ہوتی ہے۔ اس لئے جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کا حق و صداقت پر مبنی جواب دینے کے لئے بڑے حوصلہ اور جرأت کی ضرورت ہوگی ہم تو اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انا ربکم الاعلیٰ کہے اور کوئی سامنے سے چوں نہ کرے!

مسجد اقصیٰ

★

پرویز

سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:-

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی... (۱۷/۱)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کو لے گئی۔ اس آیت میں مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے جب حضورؐ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

میں نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچا دیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ متقدمین میں سے (غالباً) کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو۔ اور غلط بات غلط ہے۔ خواہ اسے ہزار بار کیوں نہ دہرایا گیا ہو (میں نے اس کے بعد اپنی کتاب "شاہکار رسالت" میں موجودہ مسجد اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کر دی تھی)

پچھلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مجھے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیر آبادی۔ ثم گجراتی) کی کتاب "حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا تھا۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مجھے مولانا صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کا مجھے علم ہے کہ وہ فرقہ اہلحدیث کے ایک ممتاز عالم ہیں۔ ایک اہلحدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو، واقعی باعث تعجب (اور چونکہ وہ مفہوم میرے نزدیک قرآن کے منشا کے مطابق ہے اس لئے وجہ حیرت) ہے۔ مولانا صاحب اگر بقید حیات ہوں (خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خدا ان کی عمر دراز کرے) تو وہ میری طرف سے اس تحقیق اور حق گوئی کی جرأت پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:-

حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن

(از مولانا عنایت اللہ اثری - وزیر آبادی - گجرات - شائع کردہ اپریل ۱۹۵۵ء)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ .... عبداً شکوراً (بنی اسرائیل) اللہ رحمٰن و رحیم کا نام لے کر پڑھو - چرچا کرو (اور) وہ خلافیوں اور غلط پیشگوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرتا کہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کردے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے ارد گرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقۂ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے اسے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آیتیں جو کہ پیش گوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے - ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیش گوئی پوری نہیں ہوئی - اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیش گوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تا کہ وہ پوری نہ ہو سکے - اسے اللہ دیکھتا رہا - اب ان کے پورا ہونے کا وقت آ رہا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جا رہا ہے - اسی طرح پر موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعون کی ناکامی اور موسیٰ کی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیش گوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آئندہ چل کر آ رہا ہے - جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقعہ ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں - قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش گوئیاں بھی کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے پوری ہو گئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا - پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلتا کرتا ہے ہم تمہیں اس بندۂ شکر گزار کی سنت پر دعوت دے کر شکر گزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۳) ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً اس اسراء نبوی کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر کسی حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زوائد میں قتادہ اور زر بن حبیش سے مقطوعاً اور عبد اللہ بن مسعودؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے موقوفاً اور ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مستزاد ہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے - علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب کا ذکر ہے ان میں آپ کے ایاب کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ ۱۱۴)

(سورۃ الانفال میں بھی عدوۃ الدنیا اور عدوۃ القصویٰ کا ذکر کیا ہے" ..... پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے

کی) بدا مکرمہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالاولیٰ قصویٰ ٹھہرا اور اس کی مسجد نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفاء جلد ۱ صفحہ ۱۴) میں مناسک وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اسکا مسجد اقصیٰ بھی ہے (حاشیہ ۱۲) صحیح بخاری (پارہ ۱۵ صفحہ ۷۷۹) میں ہے کہ مسجد نبوی جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۷۷۹) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اور وفاء الوفاء (جلد ۱ صفحہ ۲۳۲) میں بحوالہ ابن اسحٰق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پہ ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم ہے۔ اور جہاں پہ مسجد قبا تعمیر ہوئی۔ وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالم تھے اور خطیب مصعب تھے .... فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۷۷۶) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ واشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پہ مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی۔ (صفحہ ۱۲۴-۱۲۲)

[اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے ولیدخلوا المسجد کما دخلوه اول مرۃ تو اس میں المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیۃ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا (صفحہ ۱۲۴ - ۱۲۵)] "

مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں "اسریٰ" کا ترجمہ "لے گیا" کے بجائے "لے جائے گا" (روانہ کرے گا) کیا ہے۔ یعنی ماضی کے بجائے مستقبل۔ اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دئیے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

---

[۱] (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبوی کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا (زرقانی۔ عمدۃ القاری۔ وفاء الوفاء)۔ [اسی قصویٰ پر حضور نے تمام بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے]

[۲] ان مقامات پر اُردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں (طلوع اسلام)

حقائق و عبر

۱- ختمِ نبوت کی ایک دلیل

حال ہی میں مولانا احمد رضا خان بریلوی (مرحوم) کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "ختم النبوت" اس میں حضور کے خاتم النبیین ہونے کی ایک دلیل بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

(ایک روایت میں ہے کہ) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجمع اصحاب میں تشریف فرما تھے کہ ایک بادیہ نشین قبیلہ بنی سلیم کا آیا۔ سوسمار (گوہ) شکار کر کے لایا تھا۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا اور بولا، قسم ہے لات و عزیٰ کی، وہ شخص آپ پر ایمان نہ لائے گا جب تک یہ سوسمار ایمان نہ لائے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو پکارا۔ وہ فصیح زبان، روشن بیان عربی میں بولا جسے سب حاضرین نے خوب سنا اور سمجھا لبیك وسعديك يا زين من وافى يوم القيمة۔ میں خدمت و بندگی میں حاضر ہوں۔ اے تمام حاضرینِ مجمعِ محشر کی زینت۔ حضور نے فرمایا۔ من تعبد۔ تیرا معبود کون ہے۔ عرض کی۔ الذي في السماء عرشه وفي الارض سلطانه وفي البحر سبيله وفي الجنة رحمته وفي النار عذابه۔ وہ جس کا عرش آسمان میں اور سلطنت زمین میں اور راہ سمندر میں اور رحمت جنت میں اور عذاب نار میں ہے۔ فرمایا۔ فمن انا۔ بھلا میں کون ہوں عرض کی انت رسول رب العالمين وخاتم النبيين قد افلح من صدقك وقد خاب من كذبك۔ حضور پروردگارِ عالم کے رسول ہیں اور رسولوں کے خاتم۔ جس نے حضور کی تصدیق کی وہ مراد کو پہنچا اور جس نے نہ مانا، نامراد رہا۔

اعرابی نے کہا کہ اب آنکھوں دیکھے کے بعد کیا شبہ ہے۔ خدا کی قسم، میں جس وقت حاضر ہوا، حضور سے زیادہ اس شخص کو دشمن کوئی نہ تھا۔ اور اب حضور مجھے اپنے باپ اور اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں۔ اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله (صفحہ ۴۰)

اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ختمِ نبوت (جیسا واضح اور روشن) مسئلہ، نوے سال تک کیوں لاینحل رہا تھا؟ اس کے حق میں اسی قسم کے دلائل پیش کئے جاتے تھے۔ سچ کہا تھا غالبؔ نے کہ:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

۲- دوسری طرف

یہ تو ادھر کی بات ہوئی۔ دوسری طرف ذرا میرزائی حضرات کے مقتداؤں کی قرآن فہمی کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ربوہ

کریں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے یہ تو زمانہ ماقبل تاریخ کی بات ہے۔ اس زمانہ کی کوئی تحریر یا ریکارڈ دستیاب نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ کا کوئی ایسا پتھر بھی دستیاب نہیں ہو سکتا جس پر "قبل مسیح" میں کوئی سن درج نہیں (؟)

لیکن خدائے علیم و خبیر سے کوئی بات مخفی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کشفاً آدم کے سن پیدائش سے خبر دی۔ چنانچہ حضور (یعنی مرزا غلام احمد) فرماتے ہیں:

"خدا تعالےٰ نے مجھے ایک کشف کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے کہ سورۃ العصر کے اعداد سے بحساب ابجد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عصر تک جو عہد نبوت ہے یعنی تئیس برس کا تمام و کمال زمانہ کل مدت گزشتہ زمانہ کے ساتھ ملا کر ۴۷۳۹ برس ابتدائے دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وفات تک قمری حساب سے ہے۔" (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۳-۹۴)

پھر حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:-

"شمسی حساب کی رو سے ۴۵۹۸ برس بعد آدم صفی اللہ حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے۔" (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۲)

اگر ظہور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعویٰ نبوت مراد لیا جائے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] عیسوی میں فرمایا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مذکورہ بالا کشف کی رو سے آدم علیہ السلام [illegible] ۳۹۸۸ سال قبل مسیح پیدا ہوئے۔"

یہ ہے ان حضرات ("حضرت مسیح موعود" اور "حضرت مصلح موعود") کی قرآن فہمی کی ایک مثال۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جہاں تک قرآنی حقائق کا تعلق ہے عام "احمدی" حضرات کی ذہنی اور علمی سطح کیا ہوتی ہے۔ اور اس سے آپ اس کا اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات یورپ اور امریکہ کے دانشوروں کے سامنے کس قسم کا اسلام پیش کرتے ہوں گے۔ آہ "بیچارہ اسلام!"

۳۔ میکیاولی سیاست

ہم ان صفحات پر متعدد بار اس حقیقت کو بے نقاب کر چکے ہیں کہ جماعت اسلامی "اقامت دین" کی آڑ میں میکیاولی سیاست کے انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ جھوٹ بولنا ان کے مذہب میں بعض حالات میں "شرعاً" "واجب" ہو جاتا ہے۔ دھوکا دے کر قتل کر دینا ان کے نزدیک (معاذ اللہ) "مسنون" ہے۔ اسی طرح اصول شکنی بھی۔ باطل کا نظام الٹنے کے لئے انہی کے سے حربے استعمال کرنے میں انہیں کوئی باک نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی سیاست میں ایک ٹیکنیک زیر زمین (UNDER-GROUND) سرگرمیاں ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے کئی ایک ذیلی ادارے مختلف ناموں سے کام کرتے ہیں (ان کی تفصیل بھی طلوع اسلام میں دی جا چکی ہے) اب مودودی صاحب نے "مشرقی پاکستان" میں جماعت اسلامی کے کام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے۔

"وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لئے براہ راست کوئی ذریعہ نہیں۔ مختلف طریقوں سے کچھ [illegible] ہیں۔ ہمارے کارکنوں کی اکثریت بفضل [illegible] محفوظ ہے۔ ان میں جماعت اسلامی کے کارکن بھی ہیں اور اسلامی جمعیت طلبا بھی۔ وہ از سر نو منظم ہو چکے ہیں اور اتنی لگن اور تندہی سے کام [illegible] ہیں کہ [illegible] اتنا کام کر رہے ہیں مشرقی پاکستان [illegible] اسلامی

ممنوع ہے اس لیے وہ مختلف دوسرے ناموں سے کام کر رہے ہیں۔ جمعیت بھی اپنے نام سے کام نہیں کر رہی بلکہ کسی اور نام سے کام کر رہی ہے۔ (ایشیا ۲۷ راکتوبر ۱۹۷۴ء بحوالہ الاعتصام علیحدہ ور نومبر ۱۹۷۴ء) نہ معلوم "مغربی پاکستان" میں ان کے لوگ کس کس نام سے کام کر رہے ہیں اور کیا کچھ کر رہے ہیں؟

۴۔ سوشلزم کا معاشی نظام

سوشلزم کے معاشی نظام کا ڈھنڈورا تو بہت پیٹا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم متعدد بار بوضاحت بتا چکے ہیں جہاں تک بنیادی اصول کا تعلق ہے اس میں اور نظام سرمایہ داری میں کوئی فرق نہیں۔ اور وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ دونوں میں محنت کش کو اس کے کام کی "اجرت" دی جاتی ہے۔ اور یہ اجرت کام لینے والا مقرر کرتا ہے۔ خواہ وہ نجی آجر ہو جیسے گھر کے ملازموں کی شکل میں۔ خواہ دکان دار ہو۔ خواہ کارخانہ دار ہو۔ اور خواہ حکومت ہو اجرت کا معیار کام لینے والا مقرر کرتا ہے، کام کرنے والا نہیں۔ اور کام لینے والا یہ معیار کام کرنے والے کی ضروریاتِ زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے مقرر نہیں کرتا۔ وہ اسے اپنے پیمانوں کے مطابق مقرر کرتا ہے۔

روسی سوشلزم کا علمبردار ایک مجلہ پاکستان سے شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے "طلوع" اس کی نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں "حقوق اور ضمانتیں" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ روس میں سوشلزم کی رو سے محنت کشوں کو کیا کیا حقوق حاصل ہیں۔ ان میں سرفہرست یہ کہا گیا ہے کہ:

سوویت یونین کے ہر ایک شہری کو بلا لحاظ اس کی قومیت، جنس، تعلیم اور مذہب کے، روزگار حاصل کرنے اور کام کی مقدار اور معیار کے مطابق اجرت پانے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

اس کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہاں تعلیم، صحت، آرام، پنشن وغیرہ کی کیا کیا سہولتیں ہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ کام کرنے والوں کی اجرت مقرر کرنے کا معیار کیا ہے؟ اور اسے کون مقرر کرتا ہے۔ اس کا جواب ایک، اور صرف ایک ہے کہ یہ معیار ہے کام کرانے والوں کا پیمانہ! اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس نقطۂ نگاہ سے سوشلسٹ اسٹیٹ اور نظام سرمایہ داری کی حامل فلاحی مملکت (WEL-FARE STATE) میں کیا فرق رہ جاتا ہے!

ہاں! ایک فرق ضرور ہے۔ فلاحی مملکت میں محنت کشوں کو اپنی ذاتی جائداد یا وسائل پیداوار پر حقِ ملکیت حاصل ہوتا ہے لیکن سوشلسٹ اسٹیٹ میں اس کا حق نہیں ہوتا چنانچہ مقالہ مذکور میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ:

سوویت یونین کے آئین کے تحت نجی استعمال کی چھوٹی چھوٹی گھریلو اشیا کو ملکیت میں رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس ملکیت کی بنیاد نجی محنت ہو اور اس میں اجرت کی محنت کو شامل نہ کیا گیا ہو۔

سوشلسٹ نظام میں نجی ملکیت کی صرف اس قدر اجازت ہے یعنی اجرت مقرر کرنے کے اصول کی حد تک تو سوشلسٹ نظام اور نظام سرمایہ داری یکساں ہیں لیکن سوشلسٹ نظام میں روزمرہ کی اشیائے صرف سے آگے نجی ملکیت کی اجازت نہیں اس سے زائد سب کچھ مملکت کی ملکیت ہوتا ہے اور پھر مملکت جو کچھ اس ملکیت کے بل بوتے پر کرتی ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔

یاد رکھئے! انسانیت کی فلاح و بہبود کا راز صرف قرآن کے معاشی نظام میں ہے۔ وہ کام کی اجرت نہیں مقرر کرتا۔ وہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے

وسائل پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔ جب افرادِ معاشرہ اس طرح اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق نہایت جذب و انہماک اور تندہی اور جانفشانی سے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیئے چلے جاتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پیداوار میں جس قدر اضافہ ہوگا اسی نسبت سے ان کا معیارِ زندگی بلند ہوتا جائے گا۔

لیکن اس قسم کے نظام کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام افرادِ معاشرہ کا اس پر ایمان ہو کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کے لئے خدا کے حضور جوابدہ ہیں۔ اسی کو بالفاظ دیگر قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ دنیا جب تک اس ایمان پر نہیں آئے گی کوئی نظام (خواہ وہ سیاسی ہو اور خواہ معاشی) کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

۵۔ فرقہ اہلِ قرآن

ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ خدا کی کتاب پر ایمان رکھنے والی قوم (مسلمانوں) میں جب اور جہاں بھی خدا کی کتاب کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی گئی اس قوم کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ زمانے کے تقاضوں کی بنا پر ہمارا دور، قرآنی پیغام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے سابقہ ادوار کے مقابلہ میں زیادہ آمادہ تھا۔ انہی حالات کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے یہ منصب اختیار کیا کہ قرآن کی آواز کو بے عمل دخشش قوم (اور دنیا) کے سامنے پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی اور اس مخالفت میں مذہبی پیشوائیت نے ہراول دستے کا کام دینا تھا۔ چنانچہ یہ مخالفت ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس کا زور روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اس راستے میں جو سب سے بڑی روک ثابت ہوا وہ ایک نیا فرقہ تھا جس نے اسی زمانے میں جنم لیا اور جو بدقسمتی سے) اپنے آپ کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے یعنی فرقۂ اہلِ قرآن۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اس فرقہ کے بانی (مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم) کی نیت یہی تھی لیکن عملاً ہوا یہ کہ یہ قرآن کے راستے میں سب سے بڑی روک بن گیا۔ ہم نے اس فرقہ کا کبھی تفصیلی جائزہ نہیں لیا اس لئے کہ اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم کی وفات کے بعد ہی ان کے معتقدین ادھر ادھر بکھر گئے اور ان کی حیثیت محض انفرادی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں باہمدگر ایسے اختلافات نمودار ہو گئے کہ ان کی توانائیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھ کر ضائع ہو گئیں۔ (کوئی ایک نماز کا قائل، کوئی تین کا، کوئی پانچ کا۔ کوئی تین روزوں کا کوئی نو کا۔ کوئی مہینہ بھر کا۔ کسی کے نزدیک انڈہ حلال، کسی کے نزدیک حرام۔ وقس علیٰ ھذا) اب ان کے کچھ افراد سمٹ سمٹا کر لاہور میں جمع ہو گئے ہیں جو ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جس نظریہ میں زندہ رہنے کی قوت نہیں ہوتی مرورِ زمانہ اسے از خود ختم کر دیتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر

یہ فرقہ ایسی اہمیت کا حامل نہیں کہ اس کا خصوصیت کے ساتھ نوٹس لیا جائے۔ لیکن بعض اوقات ان کی طرف سے ایسی کشمرزنشانیاں ہوتی ہیں جن کا ازالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو کبھی کبھی اس فرقہ کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آجاتا ہے۔

۲۔ یہ فرقہ فکری اور عملی ' ہر دو لحاظ سے ایسی بنیادوں پر استوار ہے جن میں مسلمانوں کے باقی فرقوں، میں سے کوئی بھی ان سے اشتراک نہیں رکھتا۔ یعنی :-

(۱) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر احکامات آئے ہیں۔ ان کی تمام جزئیات اور تفصیلات بھی قرآن مجید نے خود متعین کر دی ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں اس سے پہلے کسی فرقہ نے کبھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔

(۲) ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ تین وقتوں کی نماز کے قائل ہیں۔ ہماری تحقیق کی رو سے اس سے پہلے مسلمانوں کے کسی فرقے نے ایسا نہیں کیا۔

ہم اس مقام پر بلاغ القرآن والوں کے مسلک پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ اس عقیدہ کے ماننے والوں میں سے بعض افراد نماز کے علاوہ، روزہ، زکوٰۃ، حرام، حلال وغیرہ کے معاملات میں بھی ایسی ایسی نرالی باتیں کرتے ہیں جن کا اس سے پہلے کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔

فکری اور عملی لحاظ سے مندرجہ بالا دو امور کی بنا پر ہی ان میں اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں ایک ایسی خلیج حائل ہے جس کے پُر ہونے کا امکان ہی نہیں

۳۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس فرقہ نے خود قرآن مجید کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں پہلے چند ایک مسلمات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کریم کی رو سے امتِ مسلمہ میں فرقہ بندی شرک اور خدا کے عذاب کا موجب ہے۔

(۲) قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

(۳) شق نمبر ۲ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر فکر و عمل کی بنیاد قرآن ہو تو امت میں اختلاف و تفرق (فرقہ بندی) پیدا نہیں ہو سکتی۔ (قرآن کے بنیاد بننے کی عملی شکل کیا ہے اس کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی)

(۴) امت میں مختلف فرقے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا دعویٰ یہ نہیں کہ ان کے فکر و عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ نظری طور پر قرآن کو سب مانتے ہیں لیکن عملاً ان میں سے بعض احادیث کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور بعض فقہ کو۔ لہٰذا ان کے باہمی اختلافات کے متعلق یہی کہا جائے گا (اور یہی کہا جاتا ہے) کہ ان کی وجہ روایات اور فقہ کا اختلاف ہے۔ قرآن مجید پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔

(۵) لیکن فرقہ اہلِ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان کے عمل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔

(۶) لیکن ان کے عمل کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی

نماز کے اوقات کے سلسلہ میں جو (ان کے دعوے کے مطابق) ان کا امتیازی کارنامہ ہے اسے ذرا غور سے سنئے۔

(ا) اس فرقہ کے بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) قرآنِ خالص سے ثابت کرتے ہیں کہ نماز پانچ وقتوں کی ہے۔ (ملاحظہ ہو ترجمۃ القرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی پارہ ۴ - صفحہ ۹۳ و دیگر مقامات)

(ب) اور اس فرقہ (یا عقیدہ) کے متبع، بلاغ القرآن والے، اسی قرآنِ خالص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز تین وقتوں کی ہے۔

اب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے پانچ وقتوں کی نماز بھی ثابت ہو جاتی ہے اور تین وقتوں کی بھی، تو اس کے اس دعوے کے متعلق کیا کہا جائے گا کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) "اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے" (اور یہ تو صرف ایک مسئلہ اوقاتِ صلوٰۃ کے متعلق ہے۔ اگر دیگر مسائل کو بھی دیکھا جائے تو نہ معلوم ان میں کس قدر باہمی اختلافات ملیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق یہ دعوے ہو کہ وہ قرآن سے ثابت ہے) یہ ہے ان حضرات کا وہ مسلک جس نے قرآن مجید کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس سے اس کا بنیادی دعوے ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔

(۲) قارئین شاید یہ معلوم کرنے کے بھی متمنی ہوں کہ یہ حضرات، نماز وغیرہ کی تفاصیل قرآن خالص سے کس طرح نکالتے ہیں، اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

سورۃ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہیں جو ہدایات دیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں۔ مضطرب و بیقرار نہیں ہونا۔ پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنی بات پیش کرنا۔ اس کے لئے کہا کہ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸/۳۲) خوف کی حالت میں اپنے بازو سمیٹ لینا۔ پرندہ خوف سے پھڑپھڑاتا اور اڑتا ہے۔ حالتِ امن میں وہ اپنے بازو (پر) سمیٹ لیتا ہے۔ یہیں سے یہ محاورہ ہے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) اس آیت کو لکھ کر اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اپنے ہاتھ کہنیوں تک ایک دوسرے کے اوپر جمع کر کے اپنے سینے سے ملا لو۔ یہ عاجزی کی صورت ہے۔

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھے جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ طریق جس سے یہ لوگ قرآن مجید سے احکام قرآن کی تفاصیل اور جزئیات نکال لیتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اس سے انہوں نے قرآن مجید جیسی کتابِ عظیم کو کس طرح بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے!

یہ وجہ ہے جو طلوعِ اسلام کہتا چلا آ رہا ہے کہ یہ فرقہ قرآن مجید کے راستے میں سب سے بڑی روک بن کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس وجہ سے یہ اس فرقہ کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس فرقہ کی حالت عجیب ہے اور یہ بات بھی غور سے سننے کے قابل ہے۔

ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے دیکھا کہ ہمارے زمانے میں عوام کو مشتعل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے متعلق کہہ دیا جائے کہ "یہ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔" چنانچہ انہوں نے مشہور کرنا

شروع کر دیا، کہ طلوع اسلام یہی کہتا ہے۔ اس کے جواب میں طلوع اسلام کو کہنا پڑا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے طلوع اسلام کا نہیں۔ طلوع اسلام کا اہل قرآن سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس سے ان کا اطمینان ہو جاتا لیکن (ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن مصالح کی بنا پر) بلاغ القرآن والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام اور ہم ایک ہی ہیں۔ بس بعض معاملات میں یونہی ذرا ذرا سا فروعی فرق ہے۔ اس سے طلوع اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایک حربہ (LEVER) ہاتھ آ گیا اور انہوں نے عوام میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو۔ اہل قرآن والے خود یہ کہتے ہیں کہ ہم اور طلوع اسلام ایک ہی ہیں۔ بلاغ القرآن والوں کی طرف سے طلوع اسلام کے خلاف یہ اتنی بڑی سازش ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

حال ہی میں (طلوع اسلام کنونشن میں پیش کردہ) ایک مقالہ بعنوان "تین نمازوں اور نو روزوں کے پس پردہ کیا ہے" میں (صاحب مقالہ محمد اسلام صاحب نے) بتایا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے' طلوع اسلام کا نہیں۔ اس پر بلاغ القرآن نے اپنی وسوسہ اندازی کی سلگتی آگ میں پھر پھونکیں مارنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ اس نے اپنی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۷۴ء میں "معاصر عزیز۔ طلوع اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

بلاغ القرآن اور طلوع اسلام ایک ہی راہ کے دو راہ رو ہیں۔ دونوں کی ایک ہی منزل ہے امن عالم کا قیام بذریعہ قیام نظام ربوبیت۔ یہ دونوں اس ایک ہی شاہراہ پر محو سفر ہیں۔ لیکن طلوع اسلام اپنے رفیق سفر کے ساتھ کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا سا رہتا ہے (صفحہ ۳۱)

ہم بیانگ دہل اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ نہایت مکروہ قسم کا جھوٹ ہے۔ فریب ہے انتہائی بددیانتی پر مبنی وسوسہ انگیزی ہے۔ "امن عالم کا قیام بذریعہ قیام نظام ربوبیت" دجل و فریب کا پردہ ہے۔ طلوع اسلام اور بلاغ القرآن کی نہ راہ سفر ایک ہے، نہ منزل ایک۔ نہ یہ دونوں رفیق سفر ہیں نہ ہم نوا۔ اس کے برعکس طلوع اسلام کی منزل بھی بلاغ القرآن سے مختلف ہے اور راستہ بھی اس سے یکسر الگ۔ اور ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ طلوع اسلام، فرقہ اہل قرآن اور اس کے نقیب بلاغ القرآن کو قرآن کا مخالف اور دین کا دشمن سمجھتا ہے۔ یہ بلاغ القرآن کے ساتھ "کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا سا" نہیں رہتا۔ اعلانیہ اس کی مخالفت کرنا اور اس کے انتہائی گمراہ کن نظریات کی تردید کرنا اپنا قرآنی فریضہ سمجھتا ہے۔ ہم بلاغ القرآن سے واضح الفاظ میں کہیں گے کہ وہ اپنی اس فریب کارانہ روش سے مجتنب رہے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

آخر میں اختتاماً ہم طلوع اسلام کا مسلک دہرا دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کے اور بلاغ القرآن کے مسلک کا فرق نمایاں طور پر سامنے آ جائے۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ:۔

(۱) قرآن نے (باستثنائے چند) اپنے احکام اصولی طور پر بیان کئے ہیں۔ ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں کیونکہ (احکام کی طرح) ان کی جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا مقصود نہیں تھا۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ ان جزئیات کو وہ قرآنی نظام متعین کرے جو اس کے احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور حضور کے بعد یہ خلافت علیٰ منہاج نبوت کی شکل میں سامنے آیا۔

(۲) جب خلافت علیٰ منہاج نبوت قرآنی احکام کو (مع ان کی جزئیات کے) نافذ کرے گی تو امت میں اختلاف

اور فرقہ سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یہ امت، امتِ واحدہ رہے گی۔

(۳) اس وقت امت میں بہت سے فرقے ہیں جن میں باہمی اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت موجود نہیں۔ ان اختلافات اور تفرقات کے مٹانے کی واحد صورت یہ ہے کہ امت میں پھر سے اسی خلافت کا قیام عمل میں آجائے۔ طلوع اسلام اس کے لئے کوشاں ہے۔ یہ حکومت اپنا تمام کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیگی۔

(۴) اس وقت (جبکہ وہ خلافت قائم نہیں) مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے مختلف احکام اسلام پر عمل کرتے ہیں وہ ویسا کرتے رہیں۔ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرے یا کسی نئے طریق کو رائج کرے۔ طلوع اسلام اس کی تلقین کرتا ہے اور اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ نماز کی تفصیلات کی بھی یہی صورت ہے جن جن اوقات میں اور جن جن تفصیلات کے ساتھ مختلف فرقے اسے ادا کرتے چلے آرہے ہیں ہم ان میں ردّ و بدل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے نہ کوئی نیا طریق وضع کرنے کا حق۔

آپ سوچئے کہ اگر (اہل قرآن کے نظریہ کے مطابق) ہر شخص کو اس کا حق دے دیا جائے کہ وہ جس طرح جی چاہے احکام وارکان اسلامی کی تفصیلات مرتب کرکے اپنا الگ فرقہ بنالے تو امت میں (جس میں پہلے ہی اتنے فرقے موجود ہیں) کس قدر تشتت و انتشار پیدا ہو جائے اور جب ان میں سے ہر ایک اپنے مسلک کو قرآن کی طرف منسوب کرے تو خود قرآن کے متعلق دنیا کیا کہے؟ یہ تو غنیمت ہے کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) کے بعد جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے (اہل قرآن) پیدا ہوئے۔ ان کی آواز کسی نے نہیں سنی ورنہ (دنیا کی نظروں میں) اس وقت تک (معاذ اللہ) قرآن مجید کی دھجیاں اڑ چکی ہوتیں۔

اس کا یہ بھی مسلک ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر ایسے عقائد و رسوم رائج ہیں جو خلاف قرآن ہیں ان کی نشاندہی کی جائے لیکن اس بنا پر نہ تو اپنا الگ فرقہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا جائے۔ کفر و اسلام کے تعین کا حق اسلامی حکومت کو حاصل ہے نہ کہ افراد یا فرقوں کو۔

اس مختصر سے تعارف سے آپ دیکھ لیجئے کہ کیا طلوع اسلام اور فرقہ اہل قرآن ایک ہی راستہ کے راہی اور ایک ہی منزل کے مسافر ہیں یا ان کی راہیں بھی مختلف ہیں اور منزلیں بھی ایک دوسرے سے متضاد!

"ختم نبوت" اور "تحریک احمدیت"

پرویز

اس موضوع پر اپنے انداز کی اولین تصنیف ۔ قیمت
اعلیٰ درجہ کا ولائتی کاغذ فی جلد ۰۰/ ۱۲ روپیے
کور دیدہ زیب تین سو سے زاید صفحات محصول ڈاک و پیکنگ ۲۵/ ۱ روپیہ
فرمائش جلد بھیج دیجئے۔ پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا

پتہ: ادارۂ طلوع اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ ۲ - لاهور

پاکستان میں قرآن حکیم کی تدریس

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام ہے (اور عوام اور خواص سب اس کا شکار ہیں) کہ جب ہمارے سامنے "علمائے کرام" کا نام آتا ہے تو سمجھا یہ جاتا ہے کہ ان حضرات کو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر پورا پورا عبور حاصل ہوتا ہے ہم اس غلط فہمی کا ازالہ مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں اور بالوضاحت بتاتے رہتے ہیں کہ یہ حضرات قرآنی حقائق و مطالب سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ انہیں ان کے موضوعِ تعلیم میں (جو کم از کم آٹھ نو سال پر مشتمل ہوتا ہے) انواع و اقسام کے اٹھارہ اٹھارہ "علوم" تو پڑھائے جاتے ہیں لیکن اگر کچھ نہیں پڑھایا جاتا تو وہ قرآن مجید ہے۔

ماہنامہ "فکر و نظر" کی نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں محترم حافظ محمد عقیل صاحب کے قلم سے عنوان بالا پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ (۱) ہمارے مذہبی دارالعلوموں اور اسکولوں اور کالجوں میں قرآنی تعلیم کی کیفیت کیا ہے اور (۲) قرآن حکیم کی تدریس کا صحیح طریق کیا۔ جہاں تک قرآن کریم کی تدریس کے طریق کا تعلق ہے ہم صاحب مقالہ سے متفق نہیں۔ اس لئے ہم ان کے مقالہ کے صرف ان اقتباسات کو (فکر و نظر کے شکریہ کے ساتھ) درج ذیل کرتے ہیں جن سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہمارے "علمائے کرام" کا قرآن کے متعلق مبلغ علم کیا ہوتا ہے اور اسکولوں اور کالجوں میں کس طرح قرآن کی تعلیم محض تبرکاً دی جاتی ہے۔

"پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جس کی اساس دین اسلام پر قائم ہے۔ اگر پاکستان اور اس کے نظام حکومت سے اسلام کو خارج کر دیا جائے تو ایک طرف تو دو قومی نظریہ لغو قرار پاتا ہے اور دوسری طرف پاکستان کا وجود اور بقا کا کوئی منطقی جواز باقی نہیں رہ جاتا اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام نہ صرف اسلامی نظریہ پر اعتقاد رکھیں بلکہ اسے اپنی عملی زندگیوں میں بھی اپنائیں۔

اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جس کے جملہ احکام واضح صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان احکام میں ردوبدل کی کوئی گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید میں درج ہیں اور قرآن پاک کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے یہ امر عیاں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اپنے بندوں پر نازل فرمایا ہے تو اس کی حفاظت بھی وہ اپنے بندوں کے ذریعہ سے ہی کریگا۔

پاکستان چونکہ اسلام کی اساس پر استوار ہوا اور اب بھی یہاں کے باشندے اسلامی نظریات و تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم و تدریس عام کی جائے بعض لوگ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو عربی زبان میں پڑھنا ضروری نہیں ہے اسے کسی بھی ایسی زبان میں پڑھ لیا جائے جس سے مفہوم سمجھ میں آ جائے تو یہ کافی ہے۔

ہمیں اس خیال سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کہا ہے وہ نہ تو صرف عربی الفاظ کا نام ہے اور نہ ہی مفہوم و ترجمہ کا بلکہ یہ دونوں چیزیں مل کر ہی قرآن کہلاتی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اردو، انگریزی یا عربی زبان کے اصل متن کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان میں قرآن کا مفہوم و ترجمہ پڑھتا ہے تو اسے

قرآن مجید پڑھنے والا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ قرآن حکیم کا ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور پھر وضاحت فرمائی کہ "الم" تین حروف ہیں اور اس کے پڑھنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں تو اس حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو عربی میں پڑھ کر ہی ثواب[1] حاصل کیا جا سکتا ہے مزید برآں اصل متن کے علاوہ کسی بھی زبان میں پڑھنے سے وہ اثر نہیں ہوتا جو عربی متن پڑھنے سے ہوتا ہے کیونکہ عربی متن ہی کلام الٰہی ہے

مذکورہ بحث سے ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن مجید کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہونا چاہیئے یا قرآن کا ترجمہ نہ پڑھا جائے۔ بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اولاً تو اسلامی ممالک میں عربی زبان کی اس حد تک تدریس ہر بچہ کے لئے ضروری ہونی چاہیئے جس سے وہ قرآن مجید کے عربی متن کو سمجھ سکے اور اگر کسی جگہ بعض مخصوص حالات یا ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایسا نہ ہو سکے تو پہلے اصل عربی متن پڑھا جائے اور اس کے بعد متعلقہ متن کا ترجمہ۔ ایسا کرنے میں کچھ وقت تو ضرور صرف ہوگا لیکن قرآن حکیم کی تلاوت کا اصل منشا یہی ہے کہ متن عربی کو پڑھ کر سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔[2]

اس شبہ کا ازالہ کرنے کے بعد اب ہم پاکستان میں قرآن پاک کی تدریس کا جائزہ لیتے ہیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نظام مدرسہ اور اسکول سسٹم۔ یہ دونوں نظام جیسا کہ ان کے ناموں سے عیاں ہوتا ہے، ایک دوسرے سے نہ صرف الگ ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بظاہر ان میں بعد المشرقین نظر آتا ہے لیکن انہیں اس طرح سے ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں نظاموں کو باہم ملا کر ایک ایسا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو ہماری دینی، مذہبی، ثقافتی اور تمدنی ضروریات کو بھی پورا کرے اور عصری و ملی تقاضوں کے عین مطابق بھی ہو۔

نظام مدرسہ ایک ایسا نظام تعلیم ہے جس کا خمیر مذہبی تعلیم سے اٹھایا گیا ہے اور جس کا واحد مقصد قرآن حکیم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس آٹھ سالہ نظام تعلیم میں جتنی کم توجہ قرآن پر دی جاتی ہے اور جتنا کم قرآن حکیم پڑھایا جاتا ہے اتنا کم کوئی اور علم نہیں پڑھایا جاتا۔ الا ماشاء اللہ[3]۔ بالعموم اصل متن کو نظر انداز کر کے شروع اور حواشی پر زور دیا جاتا ہے۔ ہمارے روایتی علماء نے قرآن حکیم جیسی واضح اور آسان کتاب کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا کہ براہ راست پڑھنے کی بجائے اسے دیگر علوم مثلاً فلسفہ منطق، کلام، ادب، معانی، بیان اور بلاغت وغیرہ کے ذریعہ سے سمجھنے کی تعلیم دی۔

نظام مدرسہ میں قرآن حکیم کے ابتدائی اسباق سے لے کر اس کی ممتاز ترین تفاسیر تک شامل نصاب قرار دی جاتی ہیں اور دعویٰ اس بات کا کیا جاتا ہے کہ اس نصاب کا پڑھنے والا قرآن حکیم کا نہ صرف ایک متبحر عالم ہوتا ہے بلکہ وہ قرآن کی تفسیر خود بھی عصری اور ملی تقاضوں کے مطابق کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نصاب تعلیم کو

---

[1] ثواب کے معنی ہیں قرآن کا بتایا ہوا فائدہ جو اس دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے اور آخری زندگی میں بھی۔ (طلوع اسلام)

[2] صاحب مقالہ یہاں دو متضاد باتیں کہہ گئے ہیں۔ (طلوع اسلام)

[3] یہاں "الا ماشاء اللہ" کا اضافہ سمجھ میں نہیں آیا۔ (طلوع اسلام)

پڑھ کر فارغ التحصیل ہونے والا نوجوان اکثر اوقات[1] مطالب قرآن سے بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہوتا ہے۔ نظام مدرسہ اس میں اتنی بھی صلاحیت پیدا نہیں کرتا کہ وہ قرآن حکیم کی عبارت کو کما حقہٗ سمجھ سکے، تفسیر کرنا اور اجتہادی رائے قائم کرنا تو بہت بڑی اور بعد کی بات ہے۔

اس کے بعد صاحب مقالہ نے متن قرآن کریم کی تدریس پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

اس سے آگے بڑھیں تو قرآن حکیم کے معانی و مطالب، تفسیر، اصول تفسیر اور مختلف علوم قرآنیہ کا درجہ آتا ہے۔ ہمارے مدارس عربیہ میں کوئی پچیس کے قریب علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں جو سب پرانے زمانے کی یادگار ہیں اور نصاب میں شامل کتابیں بھی صدیوں پہلے کی تصنیف کردہ ہیں۔ ان علوم و فنون کو پڑھانے کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن فہمی کا ملکہ پیدا ہو لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس ہیں۔ دینی طلبہ ان علوم و فنون اور فقہ کی موشگافیوں میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اصل متن قرآن ان کے لئے ثانوی چیز بن کر رہ جاتا ہے اور جب دینی طلبہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ ذہنی طور پر قطعاً بالغ نہیں ہوتے۔ ان کا ذہن پراگندہ خیالات کی آماجگاہ ہوتا ہے اور انہیں کسی بھی مضمون میں مہارت حاصل نہیں ہوتی۔

اس کے بعد لکھا ہے:

علم تفسیر کے بارے میں بھی ہمارے طلبہ کو کچھ نہیں پڑھایا جاتا۔ آپ مدارس عربیہ کا سارا نصاب پڑھ جائیے ہزاروں صفحات پر مشتمل اس نصاب میں آپ کو تفسیر کی صرف دو کتابوں کے نام ملیں گے اور وہ ہیں تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی۔ تفسیر جلالین کو تو تفسیر کہنا بجائے خود محل نظر ہے۔ کیونکہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالا تر ہے کہ وہ کتاب جس کے اپنے الفاظ قرآنی الفاظ سے کم یا قرآنی الفاظ کے لگ بھگ ہوں اسے تفسیر کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب زیادہ سے زیادہ قرآن پاک کا عربی زبان میں رواں ترجمہ کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے پاکستانی طلبہ کے لئے جلالین کی نسبت شاہ عبدالقادر صاحب کی موضح القرآن کہیں بہتر ہے کیونکہ وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم ہے اور اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔

جو دوسری تفسیر شامل درس ہے۔ وہ تفسیر بیضاوی ہے۔ اس تفسیر کا تعلق دور وسطیٰ کے مفسرین کی تفسیر سے ہے۔ یہ تفسیر اپنی جگہ اور اپنے دور کے طلبہ کے لئے بہت موزوں اور مفید تھی۔ اور عین ممکن ہے کہ اس وقت بھی بعض تفسیری پہلوؤں کے لئے نہایت موزوں ہو۔ لیکن وہ سب تفسیری ضرورتوں اور تدریس تفسیر کے سب تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ اس پر بھی اکتفا کر لیا جاتا تو شاید کچھ فائدہ مند ہوتا لیکن عقلی علوم کی قینچی نے یہیں بس نہیں کی بلکہ یک دم سے تفسیر بیضاوی کا باقی سارا حصہ کاٹ دیا اور صرف سورۃ البقرہ کو شامل نصاب رہنے دیا اور بسا اوقات اساتذہ نے اسے اور بھی گھٹا کر سورۃ البقرہ کے ربع اول تک محدود کر دیا۔ گویا اب مدارس عربیہ میں تفسیر قرآن کا صرف ایک چوتھائی پارہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس نصاب تعلیم کی تکمیل کے بعد جس قسم کے علماء تیار ہوں گے۔ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] 'اکثر اوقات' اور 'کما حقہٗ' نہیں۔ یہ نوجوان مطالب قرآن سے قطعاً بے بہرہ ہوتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

اور ایک امر جس کی جانب توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں قرآن حکیم کا اردو ترجمہ تک باقاعدہ نہیں پڑھایا جاتا چند ایک مدارس کو چھوڑ کر باقی سب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ابتدائی چند پاروں کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ طالب علم کو اس دور میں پڑھا دیتے ہیں جب کہ وہ ذہنی طور پر قرآن پاک کا ترجمہ سمجھنے کا اہل ہی نہیں ہوتا۔

ترجمہ اور تفسیر کے تعلق سے ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ دونوں مضامین پڑھاتے وقت علماء اپنے مکتب فکر کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ بات ہرگز نہیں ہوتی کہ حق بات کی تلاش جاری رکھی جائے بلکہ وہ تو اپنے مکتب فکر کی تبلیغ کرنا دینی تعلیم کا لازمہ خیال کرتے ہیں۔ یہ ان کی خود ساختہ احتیاط یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے ذہن میں ایک بات سوچ لی ہے کہ فلاں تفسیر پڑھائی جائے اور بس۔ انہیں اس سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ تفسیر عصری اور ذہنی ضروریات کو پورا بھی کرتی ہے یا نہیں اور اس تفسیر سے بہتر کوئی تفسیر ہے یا نہیں۔

ازاں بعد صاحب مقالہ اسکولوں اور کالجوں کی طرف آتے ہیں اور اس ضمن میں لکھتے ہیں :-

یہاں تک ہم نے دینی مدارس میں قرآن اور علوم قرآنیہ کی تدریس کا ذکر کیا۔ اب ہم اسکولوں کالجوں اور جامعات میں قرآن حکیم کی تدریس کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نظام تعلیم میں بھی قرآن حکیم کے ساتھ کم و بیش وہی سلوک کیا جاتا ہے جو دینی مدارس میں کیا جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دینی مدارس اپنے کو قرآن کی تعلیم دینے کے ذمہ دار گردانتے ہیں جب کہ زیر نظر نظام تعلیم میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا جاتا۔ اس نظام نے مسلمان بچوں کے لئے قرآن حکیم کی تدریس کا بندوبست کر دیا ہے جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان بچوں کو نہ صرف قرآنی الفاظ بلکہ اس کے معانی و مطالب سے بھی بہرہ ور کیا جائے۔

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں ذکر کیا گیا، ہمارا نظام تعلیم ہماری مذہبی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ یہ ایک علیحدہ عنوان ہے کہ ہم کونسی بنیادی تبدیلیاں کریں جو اس نظام کو مذہبی ضروریات پورا کرنے والا بنا دے۔ اس وقت ہم صرف مروجہ نظام تعلیم میں قرآن کی تدریس کا ذکر کرتے ہیں اس نظام میں دینی مدارس کے نصاب کی طرح بڑی خرابی یہ ہے کہ قرآن مجید پورا کہیں نہیں پڑھایا جاتا بلکہ اس کے بعض حصے شامل نصاب کر لئے گئے ہیں۔ قرآن کوئی ادب کی کتاب نہیں اور نہ ہی تاریخ یا قصہ کہانیوں کی کتاب ہے جس کا کچھ حصہ نمونہ کے طور پر پڑھا یا جائے بلکہ قرآن مجید مسلمانوں کے اصول حیات کا مجموعہ ہے جو شروع سے آخر تک یکساں اہمیت کا حامل ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ ہمارے لئے اہم ہے۔ اس لئے نصاب تعلیم میں ایسی بنیادی تبدیلیاں ہونا ضروری ہیں جن کی وجہ سے پورا قرآنی متن شامل نصاب ہو جائے تاکہ تعلیم کا مقصد پورا ہو سکے۔"

یہ ہے ہمارے دارالعلوموں اور اسکولوں اور کالجوں میں قرآن کریم کی تعلیم کی کیفیت! یہاں تک ہمارے نظام تعلیم میں تبدیلی کا تعلق ہے ہم متعدد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ "مذہبی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ ثنویت کو ختم کر کے ساری تعلیم ایک ہی نظام کے تابع آنی چاہیئے اس میں تدریس کا انداز یہ ہو کہ طلبا کو جو مضمون بھی پڑھایا جائے انہیں ساتھ کے ساتھ بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ طلبا عربی زبان سے اس حد تک واقف ہوں کہ وہ خود قرآنی آیات کا مطالب خود سمجھ سکیں اور اساتذہ کو قرآن حکیم پر اس قدر عبور ہو کہ وہ متعلقہ مضمون کو اس کی روشنی میں پرکھ کر پڑھا سکیں اور یوں ان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیں جو زندگی کے ہر گوشے میں انہیں حق و باطل اور غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل بنا دے اور نصب العین حیات واضح طور پر ان کے سامنے رکھ دے۔

یہ ہے طلوع اسلام کی پکار۔

شاہد عادل میانوالی

احکام القرآن میں نیا اضافہ

روٹی کے مسئلہ کی کرشمہ سازیاں

[طلوع اسلام کا موقف، مسلک اور منصب یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم معاملہ یا اسلام کی طرف منسوب کردہ کوئی عقیدہ یا حکم جب اس کے سامنے آئے تو یہ بتایا جائے کہ قرآن مجید میں اس کی بابت کیا حکم یا راہ نمائی ملتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے "قربانی کا مسئلہ" آیا تو ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ لکھا کہ قرآن مجید میں اس کی بابت کوئی حکم نہیں۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ مکہ ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں واقعہ تھا جہاں کے رہنے والے اپنی خوراک تک کے لئے باہر کی دنیا کے محتاج تھے۔ ایسے مقام پر اگر لاکھوں انسان جمع ہو جائیں تو ان کے لئے خورد و نوش کا مسئلہ جس قدر دشواری پیش کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید نے عازمینِ حج سے کہا کہ مکے جا رہے ہو تو اپنے کھانے پینے کا انتظام کر کے جاؤ اور وہ اس طرح کہ اپنے ساتھ قافلو جانور لے جاؤ۔ انہیں وہاں ذبح کرو۔ خود بھی کھاؤ اور وہاں کے ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

قرآن مجید میں بس اتنا ہی ہے۔ اس کے لئے بھی "قربانی" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ جب کعبہ میں بھی قربانی کا ذکر تک قرآن مجید میں نہیں آیا، تو یہ جو ہمارے ہاں گلی گلی، کوچے کوچے، عید کے موقعہ پر "قربانیاں" دی جاتی ہیں، اس کا قرآن مطلع میں حکم موجود ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر نہایت تفصیل سے لکھا تھا جو اب ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب، قرآنی فیصلے جلد اول میں درج ہے۔

اور یہی تھا ہمارا وہ جرم جس کی بنا پر ہمیں کافر اور مرتد قرار دے کر عوام کو مشتعل کیا گیا اور آج تک کیا جا رہا ہے۔

طلوع اسلام کے محترم قلم کار شاہد عادل ان موضوعات پر روایات اور فقہ کی روشنی میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ قربانی کے موضوع پر ان کے اکثر مقالات ان صفحات میں اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا اعادہ انہوں نے اپنے زیر نظر مقالہ میں بھی کیا ہے۔

یہ واضح نہیں کہ بن باللہ نے قربانی کے بارے میں کیا کہا تھا جس پر ان حلقوں میں اس قدر شور مچایا گیا ہے۔ لیکن اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس نے کہا تھا کہ ان کا ملک جس اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے اس کے پیش نظر اگر حکومت کی طرف سے ایک قربانی دے دی جائے تو اسے باشندگان ملک کی طرف سے قربانی سمجھ لینا چاہیئے لیکن یہ تو کافی عرصہ کی بات ہے۔ معلوم نہیں اب ان لوگوں نے اس مسئلہ کو پھر کس صورت میں اٹھایا ہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے بھی حیرت ہوئی کہ جماعت اسلامی کے حلقوں کی طرف سے کہ قربانی کو عصر حاضر کا اصلاح الدین ایوبی

قرار دیا جا رہا ہے۔ جب قذافی نے لیبیا میں بادشاہت کا تختہ اُلٹا تھا تو اس پر امریکہ نے بڑا واویلا مچایا تھا۔ چنانچہ واشنگٹن پوسٹ کے نامہ نگار نے لکھا تھا کہ :-

لیبیا، امریکہ کے باہر، امریکہ کے عظیم ترین معاشی اور عسکری مفادات کے نمائندوں میں سے ایک ہے۔ اس میں امریکہ نے صرف ایک اڈہ پچاس کروڑ روپے کی لاگت سے تیار کرایا تھا۔

اُدھر امریکہ نے اس انقلاب پر واویلا مچایا اور اِدھر جماعت اسلامی کے ایک نقیب، ہفتہ وار "زندگی" نے اپنی ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ :-

اشتراکی حکومتوں کا منصوبہ نظر آتا ہے کہ خوشحال عرب ملکوں میں حکومتوں کا تختہ الٹ کر وہاں کا اقتدار سوشلسٹوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اس طرح ان ذرائع آمدنی اور فوجی اہمیت کے علاقوں پر بھی قبضہ ہو جائے گا اور وہاں سے اسلام کا قلع قمع بھی کیا جا سکے گا۔

اب آپ مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوع اسلام)

موجودہ دور میں جسے بجا طور پر معاشیات کا دور کہا جاتا ہے، اگر کوئی صاحب روٹی کے مسئلہ پر گفتگو کرے تو دین کے خود ساختہ علمبرداروں کی جانب سے اس پر فوراً کمیونسٹ، مادہ پرست اور بے دین ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے حالانکہ اگر خود ان حضرات کے طرزِ عمل کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو کئی ایسی سنگین مثالیں سامنے آتی ہیں جن میں ان حضرات نے محض اپنی روٹی کے مسئلے کے لئے قرآن مجید تک کو استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ انہی میں سے ایک قربانی کا مسئلہ ہے جس کا قرآن مجید میں لفظ تک نہیں آیا لیکن یہ حضرات اپنے لئے قربانی کی کھالیں حاصل کرنے کی خاطر اسے قرآن مجید کے حکم کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ عید قربان قریب آ رہی ہے اس لئے اس مقصد کے لئے پھر قرآن مجید کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ بنا بریں ہم اس مسئلہ کی اصل شرعی حیثیت قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ہمارے اس مضمون کا محرک ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (لاہور) کا خصوصی شمارہ ماہ اکتوبر ۱۹۷۴ء (اقدامی نمبر) ہے اگرچہ اصولاً اس میں قربانی کا مسئلہ پیش کرنے کی کوئی تُک نہیں تھی لیکن چونکہ عید قربان قریب آ رہی تھی اس لئے "قربانی کی کھالوں کے حقداروں" نے اس کے لئے گنجائش پیدا کر لی۔ مثلاً لیبیا کے صدر کرنل قذافی کو جو امت مسلمہ کے دلوں کی دھڑکن ہیں، "دورِ حاضر کا صلاح الدین ایوبی" ثابت کرنے کے لئے موجودہ دور کے دوسرے تمام مسلمان لیڈروں کی اسلام دشمنی کی گردان دہراتے ہوئے الجزائر کے سابق صدر بن باللہ کے بارے میں یہ الزام عائد کیا گیا ہے :-

"اب الجزائر چلئے۔ ابھی ابھی وہاں صدر احمد باللہ المعروف بن بیلہ برسرِ اقتدار آئے ہیں۔ الجزائر نے اپنی ۱۳۲ سالہ جنگِ آزادی کا ثمرہ پایا ہے۔ اتنی بھاری قیمت آزادی کی، کسی مسلمان قوم نے نہیں دی ہے ہر گھر میں ایک شخص شہید ہوا ہے۔ ایثار اور قربانی میں اس کی تاریخ منفرد ہے۔ بن بیلہ تشریف لاتے ہیں۔ الجزائر کی معاشی نشاۃ ثانیہ سناتے ہیں اور ساتھ ہی بقر عید پر جانوروں کی قربانی پر چڑھ دوڑتے ہیں، اسے قومی ہلاکت خیال کرتے ہیں۔ وائے نصیب! انسانی قربانی کو کچھ نہ سمجھنے والی قوم، اس سے دل شکستہ اور پابرہنہ ہو رہنے والی قوم، اب مستحق ہے کہ جذبہ ... کی قربانی، بالفاظ دیگر احکام القرآن کو نظر انداز ... کے لئے قومی ہلاکت لائے گی یہ جرأت نے بخش دی گئی۔ (۱)" (سیارہ ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۹)

چونکہ مقالہ نگار نے صدر بن بیلہ کے اصل الفاظ نقل نہیں کئے اس لئے ہم ان کے اس اعتراض کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم انہوں نے اس سلسلے میں احکام القرآن میں جو نیا اضافہ فرمایا ہے اس کی بابت ضرور کچھ عرض کریں گے۔ قربانی کے بارے میں حضور صلعم کے ارشادات، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کا عملی نمونہ اور سلف صالحینؒ کا تفصیلی اور اختلافی مسلک پیش کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں اس قول کو پیش کر دوں جس پر فقہائے اسلام کی اکثریت کا اتفاق ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کے مصنف نے اس قول کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

یثاب فاعلھا ولا یعاقب تارکھا (جلد اول صفحہ ۵۹۳) قربانی دینے والا ثواب کا مستحق ہے لیکن اسے ترک کرنے والے پر کوئی شرعی گرفت نہیں۔

فقہائے اسلام کے اس قول سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ قربانی قرآن مجید کا حکم نہیں۔ اگر قرآن مجید میں اس کا حکم ہوتا تو یہ فرض ہوتی اور اس کے تارک پر شرعی گرفت ہوتی۔ اس تمہید کے بعد ہم اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلاً عرض کرتے ہیں۔

قربانی اور احادیث

قربانی کا حکم ثابت کرنے کے لئے عام طور پر مندرجہ ذیل پانچ احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ عن ابی رملۃ عن مخنف بن سلیم انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعرفۃ ان علی کل اھل بیت فی کل عام اضحی۔

"روایت ہے کہ حضور صلعم نے عرفہ کے مقام پر فرمایا کہ ہر گھر پر ہر سال قربانی ہے"۔

۲۔ وعن حبیب بن مخنف عن ابیہ انّہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بعرفۃ علی کل اھل بیت ان یذبح فی کل رجب شاۃ وفی کل اضحی شاۃ۔

"روایت ہے کہ حضور صلعم کو عرفہ کے میدان میں یہ فرماتے ہوئے سنا گیا کہ ہر گھر کے لئے ماہ رجب اور عید قربان کے دن ایک ایک بھیڑ ذبح کرنا ہے"۔

۳۔ عن الحسن انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بالاضحیۃ۔

"روایت ہے کہ حضور صلعم نے قربانی کرنے کا حکم فرمایا"۔

۴۔ عن ابی مسیب عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من وجد سعۃ فلیضح۔

"روایت ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ جسے فراغ دستی حاصل ہو وہ قربانی کرے"۔

۵۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم من وجد سعۃ فلم یضح فلا یقربن مصلانا۔

"حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ جس نے خوشحالی کے باوجود قربانی نہ کی وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے (یعنی وہ مسلمان نہیں)"

یہ ہیں وہ پانچ احادیث جنہیں عام طور پر قربانی کا حکم ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اب ان کے بارے میں ذرا خود ائمہ حدیث کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔ امام ابن حزم ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

یہ سب کی سب ضعیف ہیں اور پھر اپنے اس فیصلے کی تفصیل میں کہتے ہیں کہ مختف کی دونوں مذکورہ بالا احادیث، ابی رملۃ الغامدی کی روایت سے اور حبیب بن مخنف کی روایت سے، تو یہ راوی مجہول الحال ہیں۔ ان کے متعلق کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ حسن کی حدیث نمبر۳ مرسل ہے اور حضرت ابوہریرہ کی دونوں احادیث (۴ اور ۵) میں ایک راوی عبداللہ بن عیاش ابن عباس القتبانی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ غیر معروف ہے بلکہ غیر معتبر بھی ہے۔ (المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

خلفائے راشدین کا عمل

اب ہم خلفائے راشدین کے عملی نمونہ کو لیتے ہیں۔ امام شافعیؒ اپنی مشہور زمانہ کتاب، کتاب الام کی جلد ۲ کے صفحہ ۱۸۹ پر فرماتے ہیں۔

وَقَدْ بَلَغَنَا اَنَّ ابابکر وعمر کانا لا یضحیان کراھۃ اَنْ یقتدی بھما ولیظن من راھما انھا واجبۃ"۔

"ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ محض اس خدشے سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کی پیروی نہ کرنے لگ جائیں اور مزید یہ کہ لوگ کہیں انہیں قربانی کرتا دیکھ کر اسے واجب نہ سمجھ لیں"۔

امام ابن حزم نے خلفائے راشدین کے اس عمل کو ایک دوسری روایت سے بیان کیا ہے:۔

عن ابی سریحۃ حذیفۃ بن اسید الغفاری - قال لقد رأیت ابابکر وعمر ما یضحیان کراھۃ ان یقتدی بھا - (المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

"حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں نے یہ بات دیکھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اس کراہت کی وجہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں ان کی پیروی میں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں"۔

علامہ شوکانی نے اس قول کو اور زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے اور اس میں کچھ اور اجل صحابہ کرامؓ کو بھی شامل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اخرجہ البیھقی عن ابی بکر وعمر اَنَّھما کان لا یضحیان کراھۃ ان یظن من راھما انھا واجبۃ"۔ وکذلک اخرج عن ابن عباس وبلال وابی مسعود وابن عمر۔ نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۱۱۹)

"امام بیہقی نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے روایت بیان کی ہے کہ وہ محض اس وجہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ اسے واجب نہ سمجھ لیں۔ اور ایسا ہی عمل حضرت ابن عباسؓ، حضرت بلالؓ، حضرت ابومسعود انصاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے۔

ان صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابومسعود انصاریؓ کے متعلق تو یہاں تک تفاصیل آئی ہیں کہ ان کے پاس ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں موجود رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود آپ قربانی نہیں کرتے تھے۔ حنفی فقہ کے مشہور امام شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:۔

وقال ابومسعود الانصاری یقدر علی الف شاۃ دیراح خلا اضحی مخافۃ ان یراھا

الناس واجبۃً" (المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۱۲)

"حضرت ابو مسعود انصاری نے فرمایا کہ میرے پاس صبح شام ہزار بکریاں آتی جاتی ہیں لیکن محض اس وجہ سے قربانی نہیں کرتا کہ کہیں لوگ اسے واجب نہ سمجھ لیں۔"

قربانی کے واجب نہ ہونے کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا مسلک خاصا دلچسپ تھا انہی کی زبانی سنئے۔

قال عکرمۃ بعثنی ابن عباس بدرھمین اشتری بھما لحماً وقال من لقیت فقل لہ ھذہ اضحیۃ ابن عباس۔ (بدایۃ المجتہد جلد اول صفحہ ۴۱۶)

عکرمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے انہیں دو درہم کی رقم دے کر بازار سے گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور فرمایا کہ ہر ملنے والے سے کہہ دینا کہ بس یہی حضرت ابن عباسؓ کی جانب سے قربانی ہے۔

قربانی کی کھالیں

آج جو صحابہ کرامؓ کے اس عمل نمونے پر پردہ ڈالا جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ قربانی کی کھالیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ میں سے جو ہستیاں محض ثواب کے لئے قربانی کرتی تھیں تو وہ قربانی کی کھالوں کو اپنے ذاتی استعمال میں لے آتی تھیں یا انہیں فروخت کر کے گھر کی دوسری چیزیں حاصل کر لی جاتی تھیں۔ امام مالکؒ نے اپنے موطا میں صحابہ کرامؓ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ "یتخذون منھا الاسقیۃ (تنویر الحوالک جلد ۱ صفحہ ۱۰۸)" ان کھالوں کے مشکیزے بنا لیتے تھے۔"

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قربانی کی کھالیں گھر کے سامانِ ضرورت کے عوض فروخت کرنی جائز ہیں اور بعض فقہاء ان کی نقد قیمت حاصل کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

یجوز بیعۃ بغیر الدراھم والدنانیر بالعروض وقال عطاءؒ یجوز بیعۃ بکل شئی دراھم والدنانیر وغیر ذالک (بدایۃ المجتہد جلد اول صفحہ ۴۲۴)

"امام ابن حزم نے امام ابو العالیہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ قربانی کی کھالیں بیچ دینے میں کوئی حرج نہیں ان کے نزدیک اچھی بات یہ ہے کہ گوشت بھی کھاؤ۔ قربانی بھی کرو اور کچھ قیمت بھی واپس لے لو۔ دوسرے ائمہ نے جن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اساتذہ میں سے امام ابراہیم نخعی بھی شامل ہیں گھریلو سامان کے بدلے قربانی کی کھالوں کی فروخت کی اجازت دی ہے۔ (المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۸۶)

حضرت بلالؓ اور مرغ کی قربانی

قارئین شاید حیران ہوں کہ جو صحابہ کرامؓ ثواب کے لئے قربانی کرتے تھے وہ پرندوں کی قربانی کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ امام ابن حزم نے حضرت بلالؓ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے۔

"عن سعید بن غفلۃ قال قال لی بلال ما کنت ابالی لو ضحیت بدیک ولان اخذ الثمن الاضحیۃ فاتصدق بہ علی مسکین مقتر فھو احب الی من ان اضحی" (المحلی ابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

"حضرت سعید بن غفلہ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ نے ان سے فرمایا کہ وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ قربانی کے لئے مرغ ذبح کریں۔ بلکہ قربانی کی قیمت لے کر کسی حاجت مند پر خرچ کر دینا ان کے نزدیک زیادہ

پسندیدہ ہے") یہی نہیں بلکہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت بلالؓ عملاً مرغ کی قربانی دیتے تھے۔

رُوِیَ عَنْ بِلَالٍ اَنَّہٗ ضَحّٰی بِدِیْکٍ (بدایۃ المجتہد جلد اول صفحہ ۴۱۶)

"حضرت بلالؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے قربانی کے لئے مرغ ذبح کیا"۔

اسی بنا پر ائمہ فقہ میں سے ظاہری مذہب کے امام، امام ابن حزم کی فقہ میں پرندوں کی قربانی دینا جائز ہے۔ فرماتے ہیں۔

والاضحیۃ جائزۃ بکلِ حیوانٍ یُؤکلُ لحمہٗ من ذی اربع وطائر کالفرس والابل والبقر الوحشی والدیک وسائر الطیور والحیوان الحلال اکلہٗ (المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۷۰)

"ہر حیوان کی جس کا گوشت کھایا جاتا ہے، قربانی جائز ہے۔ چاہے وہ چار پائے ہوں یا پرندے، مثلاً گھوڑا، اونٹ، جنگلی گائے، مرغ اور دوسرے تمام پرندے اور حیوان کہ جن کا گوشت حلال ہے۔

حج کے موقع پر قربانی

حج کے موقع پر قربانی کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس وقت راقم الحروف اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف خلفائے راشدین اور صحابہ کرام اور سلف صالحین کے عملی نمونے پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہے۔ قرآن مجید میں حج کے لئے قربانی کے حکم کی بنا پر فقہی طور پر یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کم از کم حج کے موقع پر فرض ہے لیکن اگر خلفائے راشدین اور سلف صالحین کے عملی نمونہ کو سامنے رکھا جائے تو یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اس حکم کی اصلی حکمت کیا تھی۔ امام ابن حزمؒ اور حضرت عمرؓ کا عملی نمونہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

عن ابراھیم وکان عمرؓ یحج ولا یضحی وکان اصحابنا یحجون ومعھم الورق والذھب ولا یضحون (المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

"امام ابراہیم سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حج ادا کرتے تھے لیکن وہ اس موقع پر قربانی نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے بہت سے فقہاء جو فریضۂ حج ادا کرتے تھے اور ان کے پاس کافی مقدار میں سونا چاندی ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود قربانی نہیں کرتے تھے۔" دراصل حضرت عمر فاروقؓ کا مسلک قرآنی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔ اس بارے میں ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ (الحج ۲۸)

"ان جانوروں کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور بھوکے ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ"۔

خیال رہے کہ یہ ضرورت مند بھی حاجی ہوتے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ ہر حاجی کے لئے قربانی ضروری نہیں سمجھتے تھے اور خود ان کی ذات اس کا عملی نمونہ تھا۔

حرفِ آخر

قارئین شاید یہ جاننے کے متمنی ہوں کہ احکام القرآن میں یہ اضافہ کرنے والے اسلامی نظام کے علمبردار کون ہیں؟ تو جو حضرات سیارہ ڈائجسٹ کا مطالعہ فرماتے ہیں انہیں ان حضرات کے پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ لیکن جن قارئین کو ایسا کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تو ان کی اطلاع کے لئے یہ عرض کئے دیتے ہیں کہ جس رسالے میں موقر بے موقر مودودی صاحب کو بار بار بطور مفکرِ اسلام پیش کیا جائے اور پرویز صاحب پر کیچڑ اچھالا جائے، تو قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ اب

بھی ان کے پہچاننے میں دشواری ہو تو ہم تھوڑا سا مزید اشارہ کئے دیتے ہیں اور وہ یہ کہ اس رسالے کے ڈائریکٹر تجارت جناب مختار علی کے پنجاب یونیورسٹی یونین کے صدر منتخب ہونے کو مودودی صاحب نے اسلامی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا تھا۔

نوٹ راقم کو ڈائجسٹ قسم کے رسالوں کے مطالعے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ کرنل قذافی سے دلی محبت کی وجہ سے سیارہ ڈائجسٹ کے مذکورہ بالا شمارے کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں جس چیز کو حق ثابت کرنے پر پورا زور صرف کیا گیا ہے چند صفحات الٹنے کے بعد وہ خود بخود جھوٹ معلوم ہونے لگتی ہے ساری مثالیں پیش کرنے سے تو بات لمبی ہو جائے گی صرف ایک مثال پر جو اس شمارے کا اصل موضوع ہے اکتفا کرتا ہوں۔

صدر قذافی کے متعلق اس خصوصی شمارے میں قدم قدم پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے طرز عمل میں خلفائے راشدینؓ کے عملی نمونے کی جھلک ہے اور یہ کہ وہ موجودہ دور کے صلاح الدین ایوبی ہیں۔ اس کے مقابلے میں عرب دنیا کے ایک دوسرے مقبول لیڈر صدر ناصر پر ہر طرح کا کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے قرآن کا اعلانیہ دشمن ثابت کیا جاتا ہے (صفحہ ۲۸) اور پھر چند صفحات بعد کرنل قذافی کا یہ قول بھی نقل کر دیتے ہیں کہ صدر ناصر ان کا پیر و مرشد، لیڈر اور ہیرو ہے۔ یہاں تک کہ رسالے کے ایڈیٹر بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ قذافی بلاشبہ ناصر کا مداح ہے، ناصر سے متاثر ہے (صفحہ ۱۲۴) لیکن ایسا لکھتے وقت اتنا احساس نہ ہو سکا کہ کیا دور حاضر کے صلاح الدین ایوبی کا پیر و مرشد، لیڈر اور ہیرو، ایک قرآن اور اسلام دشمن شخص ہو سکتا ہے!

لاہور میں قیام کے لئے
PARK-WAY
پارک وے ہوٹل
صاف ستھرے ہوادار کمرے - مناسب شرح
پر نیز عمدہ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے
مستعد عملہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
فون: ۵۶۲۵۹
منیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن - لاہور

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs. 35.00 Paper back - Rs. 20.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
35-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH
Chowk Urdu Bazar, LAHORE